ماہنامہ

بیداری

حیدر آباد

مدیر

☆☆☆

حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام

☆☆☆

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد

E-MAIL

m.moosabhutto@gmail.com

www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:

03463216078

جلد بائیسواں ◯ اپریل۔ مئی 2026

قیمت: 25روپے، سالانہ: 300روپے

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
جنگ کا نئی تاریخ رقم کرنا	محمد موسیٰ بھٹو	۱۱
(امریکہ اسرائیل اور ایران کے درمیان جنگ کے حوالے سے)		
طاقت کے عالمی مرکز میں تبدیلی کے حالات	محمد موسیٰ بھٹو	۱۳
طاقت کا نشہ شخصیت میں جبر پیدا کرنے کا ذریعہ		۱۴
دینی حمیت۔ اسلام کا اہم تقاضا		۱۹
جذبہ جہاد۔ ناقابل شکست بننے کی صورت		۲۰
سینہ کی کشادگی کا بہت بڑی نعمت ہونا	علامہ ابن القیم	۲۱
بزرگوں کے حیرت انگیز واقعات	استاذ المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خان	۲۴
زندگی میں ہر وقت تغیر و تبدل کے حالات کا پیدا ہونا		۲۶
زندگی میں کام آنے والے کچھ اہم نکات		۲۹
مصنوعی ذہانت (انسان ایک نئے موڑ پر)		۳۳
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی	محمد موسیٰ بھٹو	۳۶
صالح بننے سے پہلے مصلح بننا		۳۹
ٹائم مینجمنٹ	سمیہ اسلام	۴۰
یونیورسٹیوں اور مدارس دینیہ کے ذرائع آمدن	از تحریر: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۴۶
اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے طریقے	مفتی قیام الدین قاسمی سیتامڑھی	۵۸
دوسروں کو حقیر سمجھنے کی نفسیات	محمد موسیٰ بھٹو	۶۹
ہمارے کچھ اہم معاملات	محمد موسیٰ بھٹو	۷۱
احادیث نبوی کی روشنی میں		

پبلشر ز محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

قرآن کا پیام

ہمارے نام

دل کی آنکھوں کا

ذکر سے حالت پردہ میں ہونا

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ۔
(سورۃ الکھف آیت ۹۹۔۱۰۰) (اور اس روز جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے جن کی آنکھیں میرے ذکر سے حالتِ پردہ میں تھیں)۔

اس آیت میں اہل کفر کی ایک بڑی علامت جو بیان فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی دل کی آنکھیں اللہ کی یاد سے حالت پردہ میں ہوتی ہیں اور اس کی سزا بھی سنائی گئی۔

دل، روشنی کا مرکز بھی ہوتا ہے تو وہ تاریکی کا مرکز بھی۔ جس طرح بلب یا چراغ روشنی کا ذریعہ ہوتا ہے کہ اگر بلب یا چراغ کو جلائیں گے تو اِردگرد کا ماحول روشن ہو جائے گا اور تاریکی دور ہو جائے گی، اسی طرح دل روشنی کا مرکز ہے، دل کو یہ روشنی ایمان اور ذکر کے نور سے حاصل ہوتی ہے، ذکر کا جتنا زیادہ اہتمام ہوگا، اسی قدر دل میں موجود تاریکی کی قوتیں دور ہو کر دل روشن ہوتا جائے گا۔

لیکن ذکر سے دوری کے نتیجے میں دل کی آنکھیں روشنی سے محروم ہونے لگتی ہیں اور دل نفس کے زیر اثر دنیا اور مادی سامان پر ٹوٹنے لگتا ہے، اس آیت میں اس کی سزا سنائی گئی ہے۔

اہل ایمان کا دل ایمان سے آشنا ہوتا ہے، اس لئے انشاء اللہ وہ اس آیت کے مصداق نہیں ہوں گے، لیکن ایمان کی تجدید تکرار ذکر سے ہوتی ہے، اس سے دل مادیت پسند قوتوں کو مسترد کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اپنی حالت کو نہ بدلنے والی قوموں کے ساتھ اللہ کا معاملہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (سورۃ الرعد آیت ۱۱) (اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کو نہ بدلے) ۔

اس آیت میں اللہ کی اس اٹل سنت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ ہر قوم کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کی دل کی حالت اور اس کے اعمال کی نوعیت اور اس کی مناسبت سے ہوتا ہے، اگر دل میں ایمان ویقین اور اللہ کی نعمتوں کی شکر ادائیگی کی حالت موجود ہے، اور زندگی ایمان ویقین کے تقاضوں سے ہمہ آہنگ ہے تو اس قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے اور اسے نفس پرست اور مادہ پرست قوموں پر فوقیت عطا فرمائی جاتی ہے، لیکن اگر دل میں کھوٹ اور فساد موجود ہے، اور مادیت کو اللہ پر ترجیح دینے کی روش غالب ہے تو ایسی قوم کو نہ صرف اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، بلکہ ایسی قوم کو اصولوں کی حامل طاقتور قوموں کا غلام بنایا جاتا ہے، ایمان کی دعویدار ملت اگر اعمال اور کردار میں پست ہوگی تو اس پر کردار کی حامل طاقتور قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے، جس طرح اس وقت ہو رہا ہے، اس طرح ملت کو سنبھلنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

جو اپنی حالت کو نہیں بدلتا، اللہ اس کی حالت کو ہرگز نہیں بدلتا، ایمان اور اسلام کی ظاہری اور رسمی حالت سے زندگی میں رونق، بہتری اور خوشحالی پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ کا یہ قانون ایسا ہے جو ہر دور میں قوموں پر لاگو رہا ہے اور قوموں کے عروج وزوال میں اللہ کے اسی قانون کو عمل دخل رہا ہے۔

مادیت پرست قوموں کو جو وقتی بالادستی دی جاتی ہے وہ ایک تو بعض اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ ان کو دنیا میں ڈھیل دی جاتی ہے، تیسرے یہ کہ

جب طاقتور صاحب ایمان وصاحب عمل افراد سامنے آتے ہیں تو ان کی پامالی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

اللہ کے حکم کو قبول کرنے والوں کے لئے خوش خبری

حکم قبول نہ کرنے والوں کے لئے سزا کی وعید

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۚ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۔ (سورۃ الرعد آیت ۱۸) (جن لوگوں نے اللہ کے حکم کو قبول کیا ان کی حالت بہت بہتر ہو گی، اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اگر روئے زمین کے سب خزانے ان کے اختیار میں ہوں تو وہ سب کے سب اور ان کے ساتھ ہی اتنے اور (نجات کے) بدلے میں صرف کر ڈالیں (مگر نجات کہاں؟)۔

اللہ کے حکم کو قبول کرنے کا مطلب ایمان اور اعمال صالحہ کی زندگی اختیار کرنا ہے اور اللہ کی اطاعت کے منافی چیزوں سے بچنا ہے، ایسے افراد کے لئے خوش خبری ہے کہ ان کی آخرت کی زندگی کامیابی اور خوشی سے ہمکنار ہو گی، لیکن جن لوگوں نے اللہ کے حکم کو قبول نہیں کیا یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی زندگی سے گریز اور راہ فرار اختیار کی اور نفس پرستی اور مادیت پسندی کی راہ پر گامزن رہے، ایسے لوگوں کا انجام بہت بڑا ہو گا، ایسے لوگ تمنا کریں گے کہ زمین میں جو کچھ ہے، سارے خزانے دیدیں کہ عذاب سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو۔

یہ اور اس طرح کی بہت ساری آیتیں ایسی ہیں، جو فرد کو جھنجھوڑنے کا ذریعہ بنتی ہیں کہ وہ نافرمانی کی روش ترک کر کے آخرت کے لئے پونجی جمع کرنے کا انتظام کریں، ورنہ مہلت عمر ختم ہو گی اور عذاب کا منظر سامنے ہو گا تو سخت پچھتاوا ہو گا، لیکن یہ پچھتاوا کسی کام نہیں آئے گا، دنیا میں فرد کے پاس وقت بھی ہوتا ہے، لیکن عام طور پر نفس پرستی کی قوتیں اتنی غالب ہوتی ہیں کہ وہ ایمان پر محنت کر کے ایمان کو بنانے اور اعمال صالحہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، غفلت کی یہ زندگی فرد کے لئے ہلاکت کا باعث ہو گی۔

رجوع کرنے والوں کے ساتھ بخشش کا وعدہ

اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۲۵) (اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع لانے والوں کو بخش دینے والا ہے)۔

نیکی کی راہ پر گامزن ہونا، رجوع الی اللہ کی علامت ہے، اور رجوع کرنے والوں کے لئے بخشش کا وعدہ ہے، اس طرح کی خوش خبری بندہ مومن کے لئے بڑی حوصلہ افزا ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کی شانِ عظمت کے غلبے کے زیر اثر اللہ کے عتاب سے خائف رہنے لگتا ہے، اس طرح کی آیتوں کے دھیان سے اسے تسلی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشش اس کے ساتھ شامل ہو گی اور موت سے لے کر قیامت اور پل صراط تک اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ ہو گا۔

دنیاوی زندگی کے مسائل ومشکلات بندے کی نظر میں زیادہ اہمیت کے حامل نہیں، اصل ہار جیت کا فیصلہ تو آنکھ بند ہونے کے بعد ہو گا، بندے پر یہی فکر غالب رہتی ہے، اس طرح کی آیتوں سے اسے تسلی ہوتی ہے۔

اعضائے جسم سے بازپرس کا ہونا

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۶) (کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور بازپرس ہو گی)۔

انسان، بندے کی حیثیت سے اپنے ہر معاملے میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہے، اعضائے جسم جہاں زندگی گزارنے کے کام آتے ہیں، وہاں اگر ان کے استعمال میں غیر معمولی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو نفس اعضائے جسم کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگتا ہے یہاں سماعت، اور آنکھ اور دل تینوں کا ذکر ہے، اس آیت میں اجمال سے کام لیا گیا ہے، ورنہ زبان اور دوسرے سارے اعضاء سے بازپرس ہو گی کہ ان کا استعمال کس طرح ہوا۔

اللہ سے بخشش مانگنا

اور اس کی ذات کا بندوں سے محبت کرنا

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۔ (سورۃ ھود آیت ۹۰) (اور اپنے پروردگار سے بخشش مانگو اور اس کے آگے توبہ کرو بیشک میرا پروردگار بڑا مہربان اور محبت کرنے والا ہے)۔

بندے کی خاصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہر دعا میں اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے، اس کی کوئی دعا بخشش کی طلب سے خالی نہیں ہوتی، اس طرح وہ توبہ تائب ہو کر آگے بڑھتا ہے۔

اللہ کی عبادت اور اطاعت سے غفلت کا گناہ تو ایسا ہے جو بندے سے ہوتا ہی رہتا ہے، دنیاوی مصروفیات اسے ذکر سے غافل کر دیتی ہے، غفلت کا یہ گناہ ایسا ہے جو اسے دوسرے گناہوں مثلاً فضول گفتگو وغیرہ میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے اپنے گناہوں کی مسلسل بخشش مانگتے رہنا، یہ بندے کے معمولات میں شامل ہوتا ہے، اللہ کی ذات تو ایسی ہے جو بڑی رحم والی اور اپنے بندوں سے محبت کرنے والی ہے، اللہ کا اپنے بندوں سے محبت کرنے کی نوید سنانا، یہ ایسی بات ہے جس سے بندہ حالت وجد میں آنے لگتا ہے، بندہ غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ شاید میں ہی اللہ سے محبت کرتا ہوں یعنی میری محبت یک طرفہ ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ بندے سے محبت کرتا ہے، اللہ کی یہ محبت ہی ہوتی ہے جو بندے کو کھینچ کر اللہ سے محبت کی طرف لاتی ہے اور وہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

نیکیوں کا گناہوں کو مٹانے کا ذریعہ ہونا

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۔ (سورۃ ھود آیت ۱۱۴) (بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں)۔

بندہ مومن جب قرآن پڑھتا ہے تو کافروں، مشرکوں، منافقوں اور نافرمانوں کے بارے میں سخت وعید پڑھکر اپنے بارے میں سخت متفکر ہو جاتا ہے کہ نیکیوں کا ذخیرہ تو نہ ہونے کے برابر ہے، سیاہ اعمال کا پلڑہ خاصہ بھاری ہے، ان حالات میں معافی اور بخشش کی صورت کیا ہوگی، اس فکرمندی میں جب اس کی نظر سے **ان الحسنات یذھبن السیات** (بیشک نیکیاں بُرائیوں کو مٹاتی ہیں) جیسی آیات گزرتی ہیں تو وہ پُر امید ہونے لگتا ہے کہ معافی کی صورت موجود ہے اور نیکیاں سارے گناہوں کو مٹادیں گی، بندہ مومن اگرچہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی عبادت اور اس کے اعمال اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اللہ کے حضور پیش ہو سکیں، وہ اللہ کی شان کے بالکل فروتر ہیں، تاہم یہ بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ بندے کے عاجزی اور فنائیت کے ساتھ ہونے والے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو قبولیت کا شرف بخشکر اس کے ساتھ انشاءاللہ فضل کا معاملہ ہی فرمائے گا، بندہ اپنی بساط کے مطابق نیکی کی راہ پر جس قدر بھی استقامت اور اخلاص سے چل سکتا ہے، اسے چلنا چاہئے، اللہ اپنے بندوں کا بہت قدردان ہے، اللہ کی اس قدر دانی کا اندازہ فرعون کی دربار میں حق وصداقت کی دعوت پیش کرنے والے بندہ مومن کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اس کی اس نیکی کی بنیاد پر قرآن کی پوری سورۃ کا نام ہی ''المومن'' رکھا اور دو رکوع میں اس کی پوری گفتگو بیان فرمائی، اس کا مزید اندازہ اصحاب کہف کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی ایک نیکی جو اپنے ایمان کو بچانے کے سلسلے میں ہجرت کی صورت میں انہوں نے کی تھی، وہ اللہ کو اتنی پسند آئی کہ ''الکھف'' کے نام سے پوری سورت ان کی طرف منسوب فرمائی۔

یہ آیت اللہ کی شان کریمی کا مظہر ہے کہ بندے کے گناہوں کو حسنات کی بدولت نہ صرف معاف کیا جائے گا، بلکہ انہیں مٹا دیا جائے گا، تاکہ آخرت میں وہ اپنے گناہوں کے سامنے آنے سے شرمساری سے بھی بچ سکے۔

انسان کی بہترین تخلیق کی حالت

پھر اس کا پست ترین ہونا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (سورۃ التین آیت ۴-۶) (بے شک ہم نے انسان کو (عقل اور شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر پیدا کیا ہے پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے)۔

اس آیت میں انسان کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کی پیدائش تو بہترین حالت پر ہوئی ہے، اسے جسمانی اور ظاہری طور پر دوسری مخلوق سے افضل صورت دی گئی ہے، دوسری مخلوق کی جسمانی صورت میں اعتدال و توازن کا فقدان ہے، کسی کا سر جھکا ہوا ہے تو کسی کا پیٹ نکلا ہوا ہے، انسان اس اعتبار سے سب سے بہتر حالت میں تخلیق ہوا ہے، پھر اسے ذہنی، روحانی اور نفسیاتی طور پر دوسروں پر فوقیت دی گئی ہے، ان ساری خصوصیت کے باوجود انسان نے اپنے رب کی ناشکری اور سرکشی کی راہ اختیار کی، جس مقصد کے لئے وہ پیدا ہوا ہے، اس مقصد سے اس نے انحراف اختیار کیا اور اللہ کی بڑائی کی بجائے اپنی بڑائی کی خاطر اس نے طاقت کے ذریعے دوسروں پر بالادستی حاصل کرنے کی کاوشیں کیں، اس طرح وہ پست ترین حالت میں چلا گیا، جانوروں سے بھی پست حالت، یہ انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے، اس کی وجہ سے

وہ قدرت کے قانون مکافات کے مطابق پست تر ہو گیا، مگر جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے۔

دنیاوی زندگی پر مسرور ہونا، اہل کفر کی علامت

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۔ (سورۃ الرعد آیت ۲۶) (اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیاوی زندگی (کی راحتوں) پر اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر متاع حقیر)۔

دنیا کی مادی زندگی پر مسرور ہونا، راحت کے سامان کے حصول میں توانائیاں صرف کرنا، دنیا پر فریفتہ ہونا، دولت و املاک کے جنون کا ہونا، مادی حسن سے دلبستگی کا ہونا، آخرت کی زندگی سے بے نیاز ہونا، یہ ساری چیزیں اللہ سے دوری اور ابدی زندگی سے غافل ہونے کا نتیجہ ہیں، جس کا انجام ابدی خسارہ ہوگا۔

موجودہ دور میں انسانی سطح سے لے کر قوموں کی سطح تک تعلیم و تربیت اور ذہن بنانے کے اختیارات جن طبقات کو حاصل ہیں، ان سب پر مادیت کی فکر غالب ہے، اس لئے مادیت پرستی کی فضا عام ہوتی جا رہی ہے، قرآن نے اس طرح کی مادی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں متاع حقیر قرار دے کر اہل ایمان کو اس سے بلند ہونے کی دعوت فکر دی ہے۔

اللہ سے خوف ہر بُرائی سے بچنے کا ذریعہ

ڈرنے والوں کے لئے خوش خبری

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ۔ (سورۃ البینۃ آیت ۸) (وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی ہے، یہ بدلہ ہے اس کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے)۔

اللہ کا خوف ایسی چیز ہے جو فرد کو ہر طرح کے گناہوں اور غفلت سے بچا کر ہر طرح کی نیکیاں کرنے پر اکساتا ہے اور فرد کو زندگی کے ہر مرحلے پر بیدار اور چوکنا رکھتا ہے، نفس اور مادی ماحول کے اثرات سے فرد اگر گرنے لگتا ہے تو اللہ کا خوف اسے گرنے سے بچا کر اللہ کی

راہ پر گامزن کرنے لگتا ہے، اللہ کا خوف، اور قیامت میں حساب کتاب کا ڈر اگر پیدا ہو جائے اور وہ غالب ہو جائے تو فرد کی زندگی اسلامی اعتبار سے بہتر اور پاکیزہ ہو جاتی ہے اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور ان سے ملاقات کے سلسلے میں بھی وہ غیر معمولی طور پر حساس ہونے لگتا ہے، اللہ سے خوف کی حالت جب مستحکم ہوتی ہے تو فرد کے لئے از خود راستے کا تعین ہو جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، اس لئے خوف کی حالت کو مستحکم کرنے کے کام کو ترجیح دینی چاہئے، اللہ کا خوف اللہ کی ہستی کے دھیان کے غلبے اور تلاوت قرآن سے ہی پیدا ہوتا ہے، فرد کا جب یہ دھیان غالب ہونے لگتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اور مجھے آخرت میں اپنے ہر عمل کی اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی ہے، تو یہ خوف فرد کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنے لگتا ہے، اور فرد کو حد تجاوز سے باہر جانے نہیں دیتا، حد تجاوز کیا ہے؟ دین کی عائد کردہ پابندیاں، لوگوں کی حق تلفیوں سے بچنا، اسلامی تعلیمات کے منافی چیزوں سے بچنا وغیرہ، خوف اس طرح کے سارے معاملات میں فرد کو حساس اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں اللہ سے خوف کے غیر معمولی فقدان کا نتیجہ ہے کہ اللہ اور اس کے دین سے دوری اور معاملات میں ابتری، بگاڑ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے تصادم کی فضا موجود ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

جنگ کا نئی تاریخ رقم کرنا

(امریکہ اسرائیل اور ایران کے درمیان جنگ کے حوالے سے)

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ عالمی قیادت کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوا، جو تین ساڑھے تین سو سال پہلے ہوا، مغربی قومیں زندگی کے بارے میں مادی طرز فکر اور مادی تہذیب کی علمبردار رہیں، انہوں نے یہی طرز فکر اور تہذیب مسلمان ممالک میں بھی منتقل کرنے کی کاوشیں کیں، اس کے لئے تعلیم و تربیت کے نظام اور لٹریچر سے کام لیا، چنانچہ مسلم دنیا کا ایک قابل ذکر حصہ مغرب کے سیکولر فکر سے بُری طرح متاثر ہو، جس سے ہماری اجتماعی زندگی اسلام سے دور سے دور تر ہوتی رہی، ایران امریکہ اور اسرائیل کے درمیاں جنگ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ قیادت کا تاج جو مغرب کے سروں کی زینت ہوا تھا، وہ مغرب (امریکہ) کے سر سے اترنا شروع ہوا ہے، جس سے ان شاءاللہ مسلمان ملکوں کی امریکہ کی ذہنی اور عملی غلامی سے چھٹکارے کی صورت پیدا ہو گی، اور وہ اپنے ہر طرح کے فیصلے خود کرنے کے قابل ہوں گے۔ اگرچہ جنگ کا کافی عرصہ تک جاری رہنے کا امکان ہے، لیکن اس سے بالآخر دنیا میں امریکہ کا رعب داب ختم ہو گا۔

اب تک بالخصوص مسلمان ممالک پر امریکہ کی تلوار لٹکتی رہی ہے کہ اپنے ملک کی تعمیر و تشکیل اس طرح نہیں، اس طرح ہونی چاہئے اور اپنا تعلیمی و تربیتی، سیاسی، معاشی اور عسکری نظام ہمارے دیئے ہوئے خطوط پر استوار کرو، چنانچہ مسلمان ممالک نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کرنے پر مجبور و معذور تھے، جو ملک ایسا نہ کرتا، اس کے حکمرانوں کو راہ سے ہٹا دیا جاتا، صدام حسین، قذافی، مرسی وغیرہ سے ایسا ہی ہوا۔

اس جنگ میں ایران کو جانی ومالی اعتبار سے بہت زیادہ نقصان ہوا، ان کے ہزاروں افراد مارے گئے، ایک لاکھ سے زیادہ عمارتیں تباہ ہوئی، ان کی قیادت کو مارا گیا، لیکن ان نقصانات کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے امریکہ کا رعب داب ختم ہوا، اور اس کی بے تاج بادشاہ والی حیثیت باقی نہ رہی اور ان شاءاللہ مسلمان ممالک کو اپنے فیصلے خود ہی طے کرنے کی آزادی مل رہی ہے۔

اس جنگ کے نتیجہ میں چین نئی طاقتور عالمی قوت کی حیثیت سے ابھرے گا اور ایران کی قوت میں بھی زیادہ اضافہ ہوگا، چین کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ امریکہ کی طرح دوسروں پر اپنی پالیسیاں مسلط کرنے کی راہ اختیار نہیں کرے گا اور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا احترام کرے گا۔

ایران کو بھی عملا اس کا مظاہرہ کرنا ہوگا کہ وہ شیعہ فکر کو دوسرے ملکوں میں رائج کرنے کی پالیسی اختیار نہیں کرے گا، ساتھ ساتھ مسلمان ممالک کو سیکولر طرز فکر سے دستبردار ہو کر اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ نظام زندگی اختیار کرنا ہوگا، اگر ایسا ہوا تو اس جنگ کے نتائج ملت اسلامیہ کے لئے خیر وبرکت کا باعث ثابت ہوں گے۔

طاقت کے عالمی مرکز میں تبدیلی کے حالات

کیا طاقت کے عالمی مرکز میں تبدیلی ہونے جارہی ہے؟ لگتا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے، سبب یہ ہے کہ لگ بھگ ۸۰ سال سے عالمی طاقت نے انسانیت کو پامال کرنے کا ہر حربہ اختیار کیا، فرعونیت کا مظاہرہ کیا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بنا، پسماندہ ممالک کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں لیا، مالدار مسلمان ممالک کے وسائل کو لوٹا، سب سے بڑی بات یہ کہ مختلف حربوں سے مسلمان ممالک میں مادہ پرست تہذیب کو مسلط کرنے کی کاوشیں کیں۔

اللہ کی زمین کو اس طرح فساد سے بھرنے کا نتیجہ اللہ کے عتاب کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، اور اللہ نے ایران جیسی چھوٹی ریاست کے ذریعہ عالمی قوت کے سر غرور کو توڑنے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

پوری انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کوئی قوت نشہ اقتدار میں مست ہو کر انسانیت کی حدود سے آخری حد تک پامال کرتی ہے اور خداوندی کے دعویٰ پر گامزن ہوتی ہے اور انسانوں کو غلام بنانے کو اپنا استحقاق سمجھتی ہے اور فرعونیت کی راہ پر حل کر بے پرواہ ہو جاتی ہے تو پھر وہ قدرت کے قانون مکافات کی زد میں آجاتی ہے۔

اس وقت عالمی قوت کے ساتھ قدرت کی طرف سے قانون مکافات کا یہی عمل جاری ہے، جس سے بچنے کی جتنی بھی کوشش ہوگی۔ نئی نئی مشکلات پیدا ہوتی جائیں گی۔

ہر چیز کا حل طاقت نہیں ہوتی، بلکہ عجز انکساری اور اظہار عبدیت ہوتا ہے، لیکن بدقسمتی سے طاقت کا نشہ طاقتور قوموں کو عجز وانکساری کی راہ پر آنے ہی نہیں دیتا۔

طاقت کا نشہ

شخصیت میں جبر پیدا کرنے کا ذریعہ

ہر دور کے طاقتور افراد سے یہ نکتہ سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے کہ طاقت ایک نشہ ہے، جس طرح نشہ کی حالت میں فرد اول خول بکتا ہے، اسی طرح طاقت کی صورت میں فرد آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسے اقدامات اٹھاتا ہے اور فیصلے کرنے لگتا ہے، جس سے اس سے متعلق افراد اور قوم وملک کو غیر معمولی نقصان ہوتا ہے اور اس کی اپنی شخصیت بھی مجرم ہونے کے احساس کے زیر تلے دب جاتی ہے، طاقت جس قسم کی بھی ہو، وہ فرد کو بے قابو کر دیتی ہے اور فرد دوسروں کی تحقیر وتذلیل کرنے لگتا ہے، اس لئے طاقتور افراد اگر اپنے لئے اور ملک و قوم کے لئے نافع بننا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ عام افراد سے زیادہ متوجہ الی اللہ ہونے کے لئے کوشاں ہوں، اس لئے کہ توجہ الی اللہ سے ہی طاقت کی رعونت قابو میں آنے لگتی ہے، اللہ کا خوف اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس ہی فرد کے طاقت کے نشہ کو قابو میں رکھتا ہے، ایمان کی رسمی حالت سے طاقت کی رعونت قابو میں نہیں آتی، اس کے لئے طاقتور ایمان کی ضرورت ہے۔

طاقت آفسری کی ہو، حکمرانی کی ہو، مالداری کی ہو، ہر طرح کی طاقت سے نشے کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

عالمی سطح سے لے کر مقامی سطح تک اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو فرد جتنی زیادہ طاقت کا صاحب ہے، اس کا نشہ اسی حساب سے تیز تر ہو جاتا ہے، وہ اپنے جیسے انسانوں کے لئے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔

غرور صرف اس ہستی کے شایان شان ہے، جو کائنات کی خالق ہستی ہے، اس کے علاوہ سارے انسان اس کے بندے ہیں، انہیں وقتی طاقت کے باوجود بندے کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھنا چاہئے، اگر ایسا ہو جائے تو انسانیت امن اور عزت سے زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

یہ طاقت کی رعونت ہی ہے جو انسانیت کے امن کو غارت کر دیتی ہے، اور اپنے جیسے انسانوں کی زندگی زہر کر دیتی ہے، اور چاہتی ہے کہ اپنے جیسے انسان اس کے غلام بن کر زندگی گزاریں۔

جب اللہ کا خوف وخشیت آجاتی ہے تو فرد پر اللہ کی شان عظمت غالب ہونے لگتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی طاقت کے بے جا استعمال سے باز آنے لگتا ہے اور اللہ کے بندے کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے، لیکن طاقت کے صاحب فرد کا اللہ کے خوف سے سرشار ہونا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے اللہ کے سامنے عجز کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے اور خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں کہ یااللہ مجھے طاقت کی رعونت سے محفوظ فرمالے۔

مسلم معاشروں کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کا حل دنیادار قسم کی قیادت کے بس کی بات نہیں ہے، یہ روشن ضمیر قیادت ہی ہے جو ملت کو ان بحرانوں سے بچا سکتی ہے۔

اس طرح کی قیادت اچانک پیدا نہیں ہو سکتی، وہ معاشرے سے ہی ابھر کر سامنے آتی ہے، معاشرے میں اگر دینی اور اخلاقی اعتبار سے جان موجود ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے معاشرے کو اس طرح کی قیادت عطا فرما دیتا ہے، لیکن اگر معاشرہ اس طرح کی قیادت کو پسند کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس معاشرے کو غلط اور منفی قیادت کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے نئے نئے مسائل اور بحرانوں سے دوچار کر دیتی ہے، دوسرے الفاظ میں منفی اور دنیادار قیادت مسلم معاشرے کی اجتماعی خرابیوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کی سزا بھی۔ مسلم معاشرہ

اپنے خدافراموشی پر مشتمل اعمال سے توبہ تائب ہو کر رجوع ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے اسے روشن ضمیر قیادت عطا فرمائی جاتی ہے۔

یہ مسلم معاشرے کی اپنی پسند ہے کہ وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے کس قسم کی قیادت کو پسند کرتی ہے، منفی قیادت اسے دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی راہ پر لگاتی ہے، جب کہ روشن ضمیر قیادت اسے اللہ سے قریب کر کے اللہ کی غیر معمولی مدد کی مستحق بناتی ہے۔

روشن ضمیر قیادت خود احتسابی اور اللہ کی محبت کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے، وہ اللہ کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کی خوبیوں سے بہرہ ور ہوتی ہے اور اہل باطل سے مقابلے کے لئے مستعد بھی۔ اس طرح کی قیادت قوم کی ایمانی حالت کو بہتر بنا کر ان کو ایثار اور قربانیوں کے لئے بھی تیار کرتی ہے، اس قیادت کے صدقے ملت کی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

غلط قیادت عتاب کی صورت ہوتی ہے تو صحیح قیادت انعام کی صورت، غلط قیادت کے عتاب کی نوعیت اتنی سخت ہوتی ہے کہ ملت پس کر رہ جاتی ہے اور اس قیادت سے جان خلاصی کی صورت پیدا ہی نہیں ہو پاتی۔

جب تک قوم رو دھو کر خدا سے اپنے منفی اعمال کی معافی نہیں مانگتی اور رجوع نہیں کرتی، تب تک یہ عتاب نہیں ٹلتا۔

چونکہ غلط قیادت کے ہاتھ میں ریاست کے سارے وسائل موجود ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان وسائل کو اختیار کر کے بھی قوم کو اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتی، لیکن اگر ملت کا ایک حصہ بھی اس قیادت کے اثرات سے نکل کر رجوع کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس رجوع کی برکت سے بھی اللہ تعالیٰ قوم کو صحیح قیادت عطا فرماتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قوم کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے لئے کون سی راہ اختیار کرتی ہے، رجوع الی اللہ کی صورت یہی ہے کہ صالح افراد کی صحبت کو مضبوطی سے اختیار کیا جائے، تاکہ

مزاج میں نیکی کے اثرات راسخ ہو سکیں، معاشرہ جس قدر نیکی کی راہ اختیار کرتا جائے گا، اسی قدر صالح قیادت کے آثار ظاہر ہوتے جائیں گے۔

ہم نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کسی اور جگہ بھی بحث کی ہے، وہ بحث یہاں پیش کرتے ہیں۔

''عالم اسلام کو ایک بڑا چیلنج جو درپیش ہے، وہ روشن ضمیر قیادت کے فقدان کا ہے، ہمیں ایسی قیادت کی ضرورت ہے، جو اہل باطل سے مرعوب نہ ہو، جو جرأت مند ہو اور مادی تہذیب کے علمبرداروں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا جھنڈا تھامے ہوئے ہو، اور مسلمانوں کے لئے درد دل کی حامل ہو، ایسی روشن ضمیر قیادت نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ممالک وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود پامال ہیں اور حالت زار کا شکار ہیں اور ہر جگہ مار کھا رہے ہیں۔

اس طرح کی قیادت اللہ کا بہت بڑا انعام ہوتی ہے، کہ وہ ملت کے احیا کا ذریعہ بنتی ہے، اور ان کو درپیش سارے چیلینجز سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ بھی۔

۵۷ مسلمان ممالک کے حکمرانوں میں سے کوئی بھی قیادت ملت کی یہ ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے، سبب یہ ہے کہ دنیا سے محبت، مفادات اور موت سے خوف زدگی نے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔

ہمیں اللہ سے سب سے زیادہ جو دعا کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ہمیں اس طرح کی قیادت عطا فرمائے، تاکہ ہم دنیا میں از سر نو اسلامی حوالے سے کردار ادا کر سکیں اور باطل سے مرعوبیت کی عمومی فضا کے خاتمے کے صورت پیدا ہو سکے۔

اہل باطل کو عالمی سطح پر قیادت حاصل ہے، ساتھ ساتھ طاقت بھی، اس کی وجہ سے وہ ہمارے مقتدر طبقات کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہے۔

روش ضمیر قیادت کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ قوموں کو اٹھانے، ابھارنے اور ان کو بحرانوں سے نکالنے اور صحیح راہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، قدرت کی طرف سے انہیں حکمت، فراست اور بصیرت کا وافر حصہ نصیب ہوتا ہے، اس طرح کی قیادت سے محرومی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو اس وقت ہمارا ہے کہ ہم مادی تہذیب کے علمبرداروں کے سامنے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں، جیسا اوپر عرض کیا گیا کہ روشن ضمیر قیادت قوموں پر اللہ کا انعام ہوتی ہیں، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو عملی طور پر اس طرح کی قیادت کا اہل بنائیں، ساتھ ساتھ اللہ سے مانگتے بھی رہیں۔

روشن ضمیر قیادت جو اللہ کے نور سے دیکھتی ہیں **(فانه ينظر بنور الله)** وہ اسلامی شریعت پر مکمل عامل ہوتی ہے، اس طرح کی قیادت عالم اسلام ہی کی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی ضرورت ہے، اس لئے کہ آج کل انسانیت عام طور پر ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا ہے، قوموں اور ملکوں کی سطح پر برپا ہونے والا سارا فساد اسی کا نتیجہ ہے، روشن ضمیر قیادت عالم اسلام میں ایسا ماحول پیدا کرے گی، جس سے ایمان کی شعاعیں ابھریں گی، کردار کی خوشبو پیدا ہوگی اور سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری ہوگی، اور انسانیت کے درمیان پیدا ہونے والی دوری دور ہوگی، اس ماحول سے انسانیت متاثر ہو کر اسلام سے نہ صرف آشنا ہوگی بلکہ اس سے قریب سے قریب تر ہوگی۔

دینی حمیت

اسلام کا اہم تقاضا

اسلام میں دینی حمیت کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، الحب للہ والبغض للہ، اللہ کے لئے دوستی اور اللہ کے لئے دشمنی۔ قرآن میں ایک جگہ ہے مسلماں کافروں کے لئے سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحم دل ہیں۔

قرآن میں ایک اور جگہ ہے ''جو اہل کفر سے دوستی رکھتا ہے وہ انہیں میں شمار ہوگا۔''

ایک حدیث شریف میں مسلمانوں کی مثال جسم کے اعضا کی سی بیان فرمائی گئی ہے کہ جسم کے کسی بھی ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم درد سے کراہنے لگتا ہے

کلمہ کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہے، کلمہ امت تشکیل دیتا ہے، اس امت سے وابستہ سارے افراد ایک دوسرے کے دست و بازو ہوتے ہیں، اسلام کی یہ تعلیمات ایسی ہیں جو واضح ہیں، جس کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہے، لیکن ہمارے اس دور میں اسلام کی اس تعلیمات کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے، اس کی سزا امت اس طرح بھگت رہی ہے کہ وہ منتشر ہوگئی ہے اور منتشر امت کو کفر کی طاقت کمزور سمجھکر اسے پامال کرنے کے لئے کوشاں ہے، اور مالی اعتبار سے خوشحال مسلمان ممالک نے اہل کفر کو خوش کرنے کے لئے اس کے لئے وسائل کے دروازے کھول دیئے ہیں اور کفر کی طاقت نازاں رہی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو مفتوح کر لیا ہے۔

لیکن حالات ہر وقت یکساں نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ بعض اوقات تھوڑے سے گروہ کے ذریعہ سے طاقتور گروہ کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے، اس کا ذکر قرآن نے دوسرے پارے کے آخر میں گیا ہے، مسلمانوں کو سنبھلنا چاہئے اور آپس میں وحدت کے رشتے کو مستحکم کر کے اللہ کی رسی کو مضبوط کرنا چاہئے۔

جذبہ جہاد

ناقابل شکست بننے کی صورت

جذبہ جہاد ایسی چیز ہے، جو امت کی بقا کا ذریعہ ہے، جذبہ جہاد اہل کفر کو یہ پیام دیتا ہے کہ امت کے خلاف اس کی سازشوں کا جواب جہاد اور جذبہ جہاد میں پوشیدہ ہے، امت جب تک جذبہ جہاد سے سرشار رہی، کفر اسے مغلوب نہ کر سکا، لیکن جب سے جہاد اور جذبہ جہاد سے سرمہری رہی، اس وقت سے امت مالی، ذہنی اور عملی طور پر اہل کفر کے زیر رہی ہے۔

موجودہ دور میں جہاد حکومتوں کا کام ہے، کسی مسلم ریاست میں حکومت یا مسلمہ علماء کے ایما کے بغیر جہادی اور عسکری تحریک برپا کرنا جائز نہیں۔

جہاں حکومت کا کام جہاد کرنا ہے، وہاں عوام میں جذبہ جہاد کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے، اس کی صورت تعلیمی و تربیتی نظام کے ذریعہ جہادی روح پیدا کرنا ہے۔

قومیں تعلیمی و تربیتی نظام سے ہی بنتی ہیں، اگر تعلیمی نظام کی تشکیل اللہ سے محبت کی بنیاد پر ہو تو اس سے ایسی نسلیں تیار ہوتی ہیں، جو اللہ سے ملاقات کے لئے اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں، اس طرح کی ملت اس قدر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہوتی ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور جس کے سامنے بڑی سی بڑی طاقت بھی ٹھہر نہیں سکتی۔

موجودہ دور میں تعلیمی و تربیتی نظام بھی بڑی حد تک حکومتوں کے ہاتھ میں ہے، مسلمان حکومتوں کو چاہئے کہ وہ تربیتی نظام کو اللہ کی محبت کی بنیادوں پر تشکیل دیں تو اللہ ان کی قوت میں اضافہ فرمائے گا اور انہیں ناقابل شکست بنادے گا۔

علامہ ابن القیم

سینہ کی کشادگی کا بہت بڑی نعمت ہونا

نبی ﷺ کے شرح صدر کا سب سے بڑا سبب کامل طور پر اور پوری قوت کے ساتھ عقیدۂ توحید تھا۔ اس چیز کی فراوانی ہی آپ ﷺ کے انشراح صدر کا سبب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کیا وہ جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی جانب سے نور پر ہے الخ۔'' (الزمر: ۲۲) اور فرمایا: ''پس جس کے متعلق اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اسلام کے لیے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے متعلق چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے، اس کا سینہ تنگ اور بے قرار سا بنا دیتا ہے، گویا وہ آسمان پر (زبردستی) چڑھ رہا ہے۔'' (الانعام: ۱۲۵)

اس طرح شرح صدر کے سب سے بڑے اسباب توحید اور ہدایت ہیں اور تنگی قلب کے سب سے بڑے محرکات شرک اور گمراہی ہیں۔ اور اسی قبیل میں سے نور ہے جسے اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈال دیتا ہے اور یہ نور ایمان کا نور ہوتا ہے، چنانچہ یہ سینے کو کھولتا اور وسعت عطا کرتا اور قلب میں فرحت پیدا کرتا ہے۔ جب بندے کے قلب سے نور ضایع ہوتا ہے تو وہ تنگ (دل) اور پریشان ہو جاتا ہے، گویا وہ سب سے زیادہ تنگ اور دشوار قسم کے قید خانے میں ہوتا ہے۔

جامع ترمذی میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب نور قلب میں داخل ہوتا ہے تو (قلب) میں وسعت و انشراح پیدا ہو جاتا ہے۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس کی علامت کیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: (اس کی علامت) دوام کے گھر (آخرت) کی طرف انابت اور دار الغرور (دنیا) سے نفرت اور موت کے آنے سے قبل ہی

اس کی تیاری ہے۔ چنانچہ بندے کو انشراح کے باعث اس نور کا حصہ عطا ہوتا ہے۔ یہی معاملہ نور حسی اور ظلمت حسی کا ہے۔ وہ سینے میں وسعت پیدا کرتی ہے تو یہ تنگ دلی پیدا کرتی ہے۔ اسی قبیل سے علم ہے، وہ سینے میں اس قدر انشراح اور فراخی پیدا کرتا ہے کہ دنیا بھر سے زیادہ وسعت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن جہالت تنگ دلی اور انقباض پیدا کرتی ہے، اس لیے بندے کا علم جس قدر بڑھتا ہے، انشراح اور وسعت قلب میں اسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ ہر علم کی خاصیت نہیں، بلکہ صرف اسی علم کی خاصیت ہے جو نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے۔ وہی علم فائدہ بخش ہے، اسی علم کے حاملین تمام انسانوں سے زیادہ وسیع (ظرف والے) فراخ دل، اخلاق حسنہ کے مالک ہوتے ہیں۔ اسی سے انابت الی اللہ اور اللہ کی محبت قلبی، اس کی طرف جھکاؤ اور اس کی عبادت کو نعمت سمجھنے کا احساس ہوتا ہے، حتی کہ اس سے زیادہ بندے میں کوئی بات شرح قلب کی موجب نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات انسان یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ اگر میں جنت میں اسی حالت میں (انابت اللہ کی حالت میں) ہوتا تو میری زندگی کیا خوب ہوتی!

انشراح قلب، خوش نفسی اور تنعم قلبی میں محبت کو خاص طور پر بہت زیادہ دخل ہے، چنانچہ جسے اس کا احساس ہوتا ہے، وہی اس کا رمز شناس ہوتا ہے۔ جس قدر محبت قوی اور شدید ہوگی، اسی قدر سینے میں فراخی اور انشراح ہوگا، تنگ دلی پاس بھی نہیں پھٹکتی، البتہ اگر وہ اہل باطل اور بے کار لوگوں کو دیکھ لے تو انہیں دیکھ لینے سے اس کی آنکھوں میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے اختلاط اس کے لیے روحانی بخاری بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اعراض، دوسروں کے ساتھ تعلق قلب، اللہ کے ذکر سے غفلت اور دوسروں کی محبت تنگ دلی کے سب سے بڑے اسباب ہوتے ہیں کیوں کہ جو اللہ کے سوا کسی اور سے محبت رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اسی کے باعث اسے سزا دے گا اور غیر اللہ کے زنداں میں اس

کا قلب محبوس کر دے گا، پس کرۂ ارض پر اس سے زیادہ بدبخت، تنگ دل اور بدحال کون ہوگا!

ہر حالت اور ہر مقام پر ذکر خدا کی مداومت شرح صدر کے اسباب میں سے ہے، اس لیے انشراح صدر اور نعیم قلب کے لیے ذکر میں ایک عجیب تاثیر رکھی گئی ہے اور تنگی، انقباض اور عذاب کے لیے غفلت ہی ایک عجیب تاثیر ہے۔ (زاد المعاد، مترجم مولانا رئیس احمد جعفری، ص:۴۴۸۔۴۵۰)

استاذ المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خان

بزرگوں کے حیرت انگیز واقعات

اخلاص کے نتائج و ثمرات بھی بڑے عجیب وغریب ہوتے ہیں، ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔ ایک دن بھوکے تھے، ایک باغ کی طرف گئے اور پھل کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن جلدی سے ہاتھ روک دیا کہ مالک کی اجازت نہیں ہے۔ اس باغ میں چوروں کی کمین گاہ بھی تھی۔ پولیس آئی، کوئی اور تو پکڑا نہیں گیا، بزرگ صاحب پکڑے گئے۔ اور فیصلہ ہوا کہ دونوں ہاتھ کاٹے جائیں، جب ایک ہاتھ کاٹا گیا اور دوسرا ہاتھ کٹنے والا ہی تھا کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار چیختا چلاتا آیا اور کہا، یہ چور نہیں، بلکہ فلاں نام کے اللہ کے ولی ہیں۔ لوگوں نے معافی طلب کی، انہوں نے کہا کہ غلطی میری ہے۔ میں نے ایک ہاتھ پھل کی طرف بڑھایا تھا، وہ کٹ گیا اور وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ پر کپڑا باندھے رکھتے تھے، لیکن ان کو خوشی تھی اور شکر ادا کرتے تھے کہ اس ہاتھ کے کٹ جانے سے لوگ مجھے چور سمجھیں گے، بزرگ نہیں سمجھیں گے تو مخلوق سے جان چھوٹے گی۔

یہ ٹوکریوں کا کام کرتے تھے اور ٹوکریاں دونوں ہاتھ سے بنتی ہیں۔ اور ان کا ایک ہاتھ نہیں تھا۔ تو اللہ کی قدرت اور شان کہ جب یہ بزرگ ٹوکریاں بناتے تو ہاتھ بالکل ٹھیک ہو جاتا اور بعد میں کٹا ہوا بن جاتا۔ ایک آدمی کو تجسس ہوا کہ یہ کس طرح ٹوکریاں بناتے ہیں؟ خلوت کے وقت گھر میں جا گھسا، دیکھا کہ ہاتھ صحیح ہے، اس نے مشہور کر دیا کہ یہ تو عجیب بندہ ہے! گھر کے اندر اس کا ہاتھ صحیح ہوتا ہے، یہ بزرگ بڑے پریشان ہوئے۔ اور اللہ سے شکایت کی۔ الہام ہوا کہ مجھے پسند نہیں تھا کہ لوگ میرے خالص بندے کو چور سمجھیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 570/1، سہیل اکیڈمی، لاہور)

قاری عبدالرحمن پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے، 1857ء کی جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی۔ لوگوں کو احکامات کا علم نہیں تھا اور وہ انگریزوں کے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے۔ انگریزوں کے بچے اور عورتیں آئیں اور قاری صاحب کے ہاں پناہ گزیں ہو گئیں۔ جب حالات سازگار ہوئے وہ عورتیں اور بچے چلے گئے۔ اس کے بعد قاری صاحب کے نام کمشنر کا خط آیا کہ آپ کے نام سالانہ ایک لاکھ کی جائیداد کا فیصلہ ہوا ہے۔ آپ آکر کاغذات لے جائیں۔ لیکن حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نہیں گئے، پھر وہ کمشنر خود آیا تو قاری صاحب نے پوچھا کہ انعام کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس کمشنر نے کہا کہ آپ نے ہماری عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی ہے۔ قاری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو اللہ کے لیے شریعت کے حکم پر عمل کیا ہے، انعام پانے کے جذبہ سے یہ عمل نہیں کیا، مجھے اس جائیداد کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی اخلاص کا ایک نمونہ ہے۔

زندگی میں ہر وقت تغیر و تبدل کے

حالات کا پیدا ہونا

انسانی قلب کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں الٹ پلٹ کا عمل جاری رہتا ہے، اور وہ ہر وقت ایک حالت میں نہیں رہتا، قلب کی تبدیلی کی یہ حالت ایسی ہے، جو فرد کو مختلف سوچوں کا حامل بنا دیتی ہے، جس سے فرد حالات و مسائل میں بہت زیادہ الجھ جاتا ہے، کبھی اس پر حالات و مسائل کا اچھا پہلو غالب ہوتا ہے، جس سے وہ خوشی کے لمحات سے محظوظ ہوتا ہے، جب کہ کبھی اس پر حالات مسائل کا منفی پہلو حاوی ہو جاتا ہے، جس سے اس پر یاس کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

فرد زندگی بھر قلب کی اس پلٹ پلٹ کی حالت میں رہنے لگتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی کیفیات اور دلی حالات میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے، یہ تبدیلی ایسی ہے جو اسے تھکا دیتی ہے، اس کا ذہن شل ہونے لگتا ہے اس کی شخصیت مد و جزر کی حالت سے دوچار ہونے لگتی ہے۔اور اس میں جھنجھلاہٹ پیدا ہونے لگتی ہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

اس صورتحال سے بچنے کی ایک تو صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک مرکزی نکتہ پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی جائے وہ مرکزی نکتہ اپنی عبدیت (بندہ ہونے کا) مسلسل مظاہرہ اور متوجہ الی اللہ ہونے کا نکتہ ہے، متوجہ الی اللہ ہونے سے اللہ کے انوار کا ورود اس کے دل پر ہونے لگتا ہے، جس سے قلب کی الٹ پلٹ کی حالت میں بہت کمی واقع ہوتی ہے اور زندگی کے مسائل سے تھک جانے کی نوبت پیدا نہیں ہوتی اور مادیت پسند انسانوں کی شرارت کے اثرات سے وہ بڑی حد تک محفوظ رہنے لگتا ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دنیا سے ضرورت کی حد تک تعلق رکھے، زیادہ نہیں، زیادہ تعلق رکھے گا تو وہ شدید اضطراب کے حالات سے دوچار ہوگا اور موبائل کے استعمال کو بھی کم سے کم کرنا پڑے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ جب بھی قلب میں غیر ضروری حالات سے بیزاری اور کدورت کی صورت پیدا ہو، اس وقت تک صبر سے کام لیا جائے، صبر بندہ مومن کا بڑا ہتھیار ہے، مزاج کے خلاف حالات و واقعات پر صبر سے قوت و استعداد پیدا ہوتی ہے اور مایوسی سے بچاؤ کی بھی۔

قرآن میں صبر پر بہت زیادہ زور ہے، بندہ مومن کی زندگی ایک طرح سے صبر سے ہی عبارت ہے، نفس کی قوتوں کے خلاف صبر، مادیت پرست انسانوں کی مادیت کی آگ بھڑکانے والی کوششوں کے خلاف صبر، نامساعد حالات کے وقت صبر، عبادت اور ذکر و فکر کے وقت شیطان کی مزاحمتوں کے خلاف صبر، صبر سے شخصیت میں استحکام پیدا ہوتا ہے، لیکن صبر کے لئے ذکر و فکر کا بہت زیادہ سہارا لئے بغیر چارہ کار نہیں۔

حضرت حنظلہ کا واقعہ ہے کہ وہ راستہ میں کہتے جا رہے تھے کہ حنظلہ ہلاک ہو گیا، حنظلہ ہلاک ہو گیا، حضرت ابا بکر صدیقؓ نے ان کی یہ بات سن لی، ان سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے، انہوں نے کہا کہ جب ہم حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں تو آخرت کا منظر سامنے ہوتا ہے، جب آپ سے جدا ہوتے ہیں تو یہ کیفیات باقی نہیں رہتی، حضرت ابا بکر صدیق نے فرمایا کہ میری بھی تو حالت یہی ہے، چلیں حضور ﷺ سے دریافت فرما لیتے ہیں حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت حنظلہ نے وہی بات دہرائی کہ حنظلہ ہلاک ہو گیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ہلاکت کی کوئی بات نہیں، اگر میری مجلس میں ہونے والی تمہاری کیفیات ہر وقت جاری رہتی تو پھر تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے رہتے۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے دل پر بھی غبار آجاتا ہے اور میں روزانہ ستر یا دوسری روایت میں ہے سو بار استغفار کرتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو مختلف حالت میں رہ کر رکھ کر اسے صبر شکر کی مزاج کو پختا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

زندگی میں کام آنے والے

کچھ اہم نکات

- دوسروں کے قصوروں کو دیکھنے سے اپنے قصور دیکھنے سے محرومی ہوتی ہے۔
- دوسروں کے حالات جانچتے رہنے کی فکر سے اپنے حالات سے غفلت کی حد تک بے خبری ہوتی ہے۔
- غیر ضروری گفتگو سے بے عقلی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور دل کی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔
- زیادہ میل جول سے دوسروں کے اثرات قبول کرنے کی عادت پختہ ہوتی ہے۔
- ذکر سے جو وقت بھی غفلت میں گزرتا ہے، وہ وقت دنیا کے تفکرات میں گزرنے لگتا ہے۔
- دنیا کے تفکرات اپنے ساتھ آخرت کی فکر کو مدھم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔
- دوسروں کو حقیر سمجھنے سے فرد خود اللہ کی نظر میں حقیر ہونے لگتا ہے۔
- نفس کی اصلاح کا معیار کم گوئی اور حالت اشتعال کی کمی اور مزاج کا ٹھہراؤ ہے۔
- دوسروں کے قصور معاف کرنے سے دانائی کے اجزاء حاصل ہوتے ہیں۔
- ایک غلط کام کی عادت دوسری کئی منفی عادتوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔
- منفی عادت ایسی چیز ہے، جس سے نجات پانا بہت مشکل کام ہے، اس کے لئے عرصہ تک ذکر سے کام لیناپڑتا ہے۔
- ذکر کی عادت سے زندگی، رونق سے عبارت ہونے لگتی ہے۔

•روزانہ اپنے آپ کو نصیحت کرنا ضروری ہے، نصیحت کرنے کا مطلب خود احتسابی سے کام لیتے رہنا ہے۔

•جو شخص گھر والوں کے لئے اچھا نہیں ہے، وہ دوسروں کے لئے اچھا نہیں ہو سکتا۔

•سوشل میڈیا پر غیر ضروری پروگرام دیکھنے سے ذہن منتشر ہونے لگتا ہے اور ذہن کو ایک مرکزی نکتہ پر لانے میں بڑی مشقت سے کام لینا پڑتا ہے۔

•صبح سویرے کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے، اس وقت فضا میں انوار موجود ہوتے ہیں، اسے ضایع کرنے سے بچنا چاہئے اور اس وقت دلجمعی سے ذکر کرنا چاہئے، صبح کے قیمتی وقت کو ضایع کرنے سے زندگی بے برکتی سے عبارت ہونے لگتی ہے۔

•عشا کی نماز پڑھکر فورا سونا چاہئے، اس سے صبح سویرا اٹھنے میں مدد ملتی ہے۔

•موبائل ایسا آلہ ہے، جو دنیاوی مقاصد کے لئے ایجاد ہوا ہے، وقت بوقت موبائل دیکھتے رہنے سے دینی مزاج اور دینی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔

•دل جب تک دنیا سے سرد مہر نہیں ہوتا اور دنیا کی رغبت کم نہیں ہوتی، تب تک فرد کی اصلاح نہیں ہوتی۔

•دوسروں کو نفع پہنچانے کی وصف کا ہونا، دوسری بہت ساری خوبیوں اور صفات کا ذریعہ ہوتی ہے۔

•زندگی نام ہے احساس کی پاکیزگی کا، پاکیزہ احساس کا حامل فرد ہر طرح کے حالات میں مستحکم ہوتا ہے اور وہ متزلزل نہیں ہو پاتا۔

•نفس پرستی کی قوتوں سے بچاؤ اور خدا پرستی کی راہ پر چلتے رہنے کی استعداد نیک لوگوں سے وابستہ ہونے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ نیک لوگوں کی صحبت سے

طاقتور مثبت شعائیں منتقل ہوتی رہتی ہیں، جو مادیت پر مشتمل ماحول کی منفی شعاؤں کو روکنے کا کردار ادا کرتی ہیں۔

•جب ذکر دل کی گہرائیوں سے ہونے لگتا ہے تو دوسری دنیا کی کھڑکی کھل جاتی ہے اور تازہ ہواؤں کے جھونکے آنے لگتے ہیں۔

•ماں باپ، استاد اور روحانی استاد کو اذیت پہنچانے سے فرد خیر و برکت سے محروم ہونے لگتا ہے، اور ان کا رنجیدہ دل ایسے فرد کا پیچھے کرنے لگتا ہے، جس سے وہ سکوں کے لئے ترسنے لگتا ہے۔

•محبت ایسی ہے، جو ہر درد کی دوا ہے، محبت سے سارے دکھ درد اور غم آسان ہو جاتے ہیں اور فرد روزانہ محبت کے مراحل سے گزر کر، تازہ اور پختہ ہو جاتا ہے۔

•وقت بوقت غصہ کا ہونا ایسی چیز ہے، جس سے شر پیدا ہوتا ہے، اور معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ بھی، غصہ کا شیطان بڑے بڑے اداروں کو ختم کر دیتا ہے، اس سے افراد کی دلیں ایک دوسرے کے بارے میں زہریلی ہو جاتی ہیں، غصہ کا حق صرف تین طبقوں کو حاصل ہے، ماں باپ کو اولاد پر، استاد کو طالبوں پر اور محکمہ کے ذمہ دار فرد کو اپنے ماتحتوں پر۔اس کے علاوہ غصہ کے نتائج غیر معمولی طور پر نقصان دہ ہوتے ہیں۔

•اللہ کے لئے مجاہدوں کا پھل میٹھا ہوتا ہے، جو فرد زندگی بھر کھاتا رہتا ہے، یہ پھل ایسا ہوتا ہے، جس سے خوشی اور تسکیں ہوتی ہے، مزاج میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے، انسانیت آتی ہے، اور دوسروں کی دل آزاری سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

دل کی حفاظت، آنکھوں کی حفاظت اور زبان کی حفاظت یہ ایسی چیزیں ہیں، جس سے اسلام کی سلامتی وابستہ ہے، اور یہ کام ایسا ہے جو زندگی بھر کا کام ہے، زندگی بھر ان تینوں چیزوں کی حفاظت کے لئے مستعد ہونا پڑتا ہے، دوسری صورت میں نفس اور شیطان کی تاک سے بچنا مشکل ہے۔

•بندہ مومن زندگی میں زیادہ ابتلاو آزمائش سے دوچار ہوتا ہے، جو زیادہ اللہ سے قریب ہوتا ہے، وہ اتنا زیادہ آزمائش میں آتا ہے، حق پر قائم رہنے کی آزمائش، صحت کی خرابی کی آزمائش، اپنوں اور غیروں کی مخالفت کی آزمائش، معاشی طور پر تنگی کی آزمائش وغیرہ، اس طرح کی ساری آزمائشوں سے مقصود بندہ کو مستحکم کرنا اور اس کے گناہوں کی بخشش اور درجات کو بلند کرنا ہوتا ہے، اس لئے آزمائشوں پر صبر کا ہونا ضروری ہے۔

راہ محبت میں چلنے والا فرد وقت کو ضایع کرنے کا متحمل نہیں ہوتا، اس لئے کہ اسے مشاہدہ ہوتا ہے کہ یہ وقت ہی ہے، جس کے صحیح استعمال سے وہ آداب بندگی بجالانے اور اللہ سے قریب ہونے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

•زندگی کے ہر موڑ اور ہر مرحلہ پر نفس کے شر سے بچنے کا اہتمام ہونا ضروری ہے، تھوڑی بھی غفلت ہوئی تو فرد نفس کا شکار ہونے لگتا ہے، نفس کی ساخت میں گرنا ہی لکھا گیا ہے، گرنے سے بچنے کے لئے ہر وقت اس سے چوکس ہونا اور اس سے مزاحمت کا حوصلہ ہونا ضروری ہے۔

•دنیا کی فکر کا ہونا تشویش کی بات نہیں ہے، تشویش کی بات یہ ہے کہ آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی فکر غالب ہو۔

مصنوعی ذہانت

(انسان ایک نئے موڑ پر)

جدید انسان نے ایک ایسی طاقتور مشین ایجاد کی ہے جو ہمہ گیر اثرات کی حامل ہے اور جس میں خیر اور شر دونوں کے اجزاء موجود ہیں، یہ مشین ہر طرح کی معلومات فراہم کرتی ہے، کسی بھی موضوع پر اس کے پاس ہزاروں کتابوں کا مواد موجود ہوتا ہے، ان ہزاروں کتابوں کے مواد کے خلاصے کو وہ چند منٹ کے اندر پیش کر کے فرد کو معلومات سے بہرہ ور کرتی ہے اور کتابوں اور ذہن چلانے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

یہ طاقتور مشین افکار نظریات، شخصیات، مذاہب، فلسفہ، تصوف، صحت کے مسائل اور بیشتر دنیاوی علوم وفنوں کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتی ہے کہ فرد حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

اس مشین سے طلبہ، اساتذہ، وکلا، سرکاری ملازمین اور فنی وٹیکنیکل شعبوں کے افراد اپنے اپنے شعبوں سے متعلق بہت ساری قیمتی معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور یہ معلومات انہیں چند منٹ کے اندر اندر حاصل ہوتی ہے، اس مشین کا یہ تحرک دیکھکر انسان حیرت زدہ ہونے لگتا ہے، یہ مشین جہاں مفید معلومات فراہم کرتی ہے، وہاں اس مشین کو دھوکہ دہی، فریب، جھوٹ، ایک دوسرے کو لڑانے، شخصیتوں کو ابھارنے، مصنوعی نوعیت کی شخصیتوں کا امیج پیدا کرنے، جاسوسی کرنے اور لوگوں کی ہر وقت نگرانی کرنے، دشمن کو جنگ کی منصوبہ بندی کر کے دینے جیسے مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اس طرح یہ مشین دودھاری تلوار کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مشین دراصل جدید مادہ پرست انسان کی تخلیق ہے، اصل مقصد اس مشین کے ذریعہ پیسہ کمانا اور مادی تہذیب کو فروغ دینا ہے۔

یہ مشین کیا ہے؟ اسے مصنوعی ذہانت کہتے ہیں، موجودہ دور مصنوعی ذہانت کا دور ہے، ہر سمجھدار شخص اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بھی مصنوعی ذہانت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس طرح ذہنی محنت کا عمل بھی بُری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

مصنوعی ذہانت کی مشین کو دجالی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے تو مفید اور بہتر معلومات کے لئے بھی۔ مصنوعی ذہانت احساس کی پاکیزگی بلکہ ہر طرح کے احساس سے خالی ہے، اس لئے وہ معلومات تو دے سکتی ہے، لیکن فرد کی شخصیت میں پاکیزہ احساس اور پاکیزہ کیفیات پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

مصنوعی ذہانت نے جدید انسان کو اس طرح کی مزید چیزوں کی ایجاد پر اکسایا ہے، مصنوعی بیوی، مصنوعی انسان وغیرہ، مصنوعی بیوی انسان سے روٹی مانگے بغیر اس کی جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ دراصل قدرت کی تخلیق میں دخل اندازی ہے، اور انسانی فطرت سے جنگ جوئی کا عمل بھی۔

انسان اس سمت میں جتنا آگے بڑھے گا، انسانی معاشرہ اسی قدر تباہی کا منظر پیش کرے گا۔

عقل کا صحیح استعمال بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، اللہ تعالی جدید انسان کو صحیح عقل اور عقل کے صحیح استعمال کی نعمت عطا فرمائے۔

جدید انسان کو اے آئی جیسی طاقتور معلوماتی مشین سے زیادہ ایک اور چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، ایسی چیز جو روح کو طاقتور، متحرک اور فعال بنا سکے، تاکہ روح اپنے پیدا کرنے والی ہستی سے والہانہ محبت کر سکے، اس محبت کی وجہ سے جدید انسان مادیت کی دلدل سے نکل سکے اور اپنے جیسے بندوں سے اس کے تعلقات اغراض و مفادات کی بجائے محبت کی بنیادوں پر استوار ہو سکیں۔

کیا سائنس جدید انسان کی اس ضرورت کو پورا کر سکتی ہے، اہل سائنس جب خدا پرستی کے عقیدہ کے حامل ہو جائیں تو اس کے بعد امید کی جا سکتی ہے کہ ایسی مشین وجود میں آئے جو انسانی شعور کے ذریعہ روح کو متحرک کر سکے۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ایک شاعر کا شعر ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس شعر میں موجودہ دور کے لگ بھگ ہر شخص کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے، اگرچہ شعر کا پہلا حصہ قابل اعتراض ہے، اسے یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بڑی سی بڑی شخصیت ہوا کرے کوئی۔

موجودہ دور کے انسان کا سب سے بڑا دکھ کیا ہے، جس سے سارے دکھوں نے جنم لیا ہے جس سے پوری انسانیت دکھوں سے بھر گئی ہے؟ یہ دکھ دراصل روح کے بے پناہ اضطراب کا دکھ ہے، یہ دکھ دل کے جذبات واحساسات میں شدید ترین ہلچل اور تلخی کا دکھ ہے، یہ دکھ شدید فکری انتشار کا دکھ ہے۔ان تینوں جوہری چیزوں کے دکھوں نے مل ملا کر انسانی شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسے فساد سے دوچار کر دیا ہے۔

اخلاقی بے راہ روی ہو، یا کردار کا بحران، ایک دوسرے سے کشیدگی ہو یا انسان آزاری کی روش، یہ ساری خرابیاں نتیجہ ہیں، دل اور روح کو صحیح سمت میں گامزن نہ کرنے اور ان کو صحیح غذا نہ دینے کا۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ روحانی طور پر مضطرب انسان نہ صرف خود بے یقینی کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے، بلکہ وہ آگ اپنے ملنے جلنے اور اپنے متعلقین میں بھی منتقل کرتا رہتا ہے، جب ۹۵ فیصد سے زیادہ انسانیت شدید روحانی کرب کا شکار ہو تو اس سے انسانوں کو ایک

دوسرے سے دکھ، درد اذیت، غم، ظلمات اور تاریکی ہی منتقل ہوگی، اس سے حلاوت اور نور تو منتقل نہیں ہوگا۔

یہ ایسا نکتہ ہے، جسے بدقسمتی سے جدید دور کا انسان عام طور پر سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے دکھوں کی آگ میں جلنا اس کا معمول بن گیا ہے۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ ایک فرد کی صدا نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت یہی کہہ رہی ہے، لیکن دکھ کے لئے جو علاج ہونا چاہئے، یا جو طریقہ علاج اختیار کرنا چاہئے، عام طور پر انسانیت ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اس لئے کہ انسانیت دل اور روح کے خانہ کو اپنی شخصیت سے نکال چکی ہے، جب دل اور روح کا خانہ موجود نہ ہوگا یا خالی ہوگا تو اس کے بعد شخصیت میں نفس اور دماغ باقی رہتا ہے، نفس کی جو خاصیت ہے وہ ہر طرح کے خواہشات کی تکمیل ہے، نفس، عقل کو یرغمال بنا کر نفس پرستی میں معاونت کی راہ پر لگا دیتا ہے، جس سے دکھ درد، غم زدگی اور بے راہ روی کی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ ارتقا پذیر ہوتی ہے، اسی سے انسانی زندگی فساد سے بھر جاتی ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پوری انسانیت معرفت نفس اور معرفت رب سے محرومی کی وجہ سے ہر اعتبار سے شدید بحران کا شکار ہے، لیکن دنیا بھر کے مؤثر اور مقتدر طبقات انسانیت کے اس سنگین مسئلہ کو سنجیدگی سے لینے کے فہم سے قاصر ہیں، مادی اور ٹیکنالوجی ترقی میں تو ساری ذہنی اور جسمانی توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، لیکن دلوں میں لگی ہوئی جو احساسات وجذبات کی بڑھتی ہوئی آگ ہے، اس کو بجھانے اور انسانی شخصیت میں ٹھہراؤ پیدا کرنے والے اہم ترین کام سے بے حسی کی فضا غالب ہے۔

یہ دراصل مادیت پرستی پر مبنی اجتماعی نظام کی تشکیل کی سزا ہے، جو قدرت کی طرف سے انسانیت کو مل رہی ہے۔

میرے درد کی دوا کوئی کرے

یہ دوا اور علاج ہو سکتا ہے، اگر فرد و افراد میں یہ طلب موجود ہو کہ ہمارا درد ہمارے لئے ہلاکت خیز ثابت ہو رہا ہے، اور ہر صورت میں اس درد کا علاج کرنا ہے، یہ طلب جب شدید صورت میں پیدا ہو گی تو اس کے لئے تلاش و تحقیق ہو گی، قدرت اس طلب کو دیکھکر انسانیت کے اس درد کے مداوے کی صورت پیدا فرمائے گی۔

صالح بننے سے پہلے مصلح بننا

ایک عارف کا مقولہ ہے کہ صالح بننے سے پہلے مصلح بننا یا دوسروں کی اصلاح کے مقام پر فائز ہونا خطرہ سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے نفس کی بیماریاں سامنے آئیں گی اور اصلاح کے نام پر انتشار پیدا ہو گا اور جھگڑے شروع ہوں گے۔

صالح بننے کا عمل نفس کو مہذب بنانے کا عمل ہے، جس سے نفس کی سرکشی کا زور ٹوٹتا ہے اور وہ آداب انسانیت سے آشنا ہوتا ہے۔

صالح بننے کے ذریعہ سے مصلح بننا، اس سے معاشرہ دینی اور روحانی طور پر مستحکم ہوتا ہے، اس طرح کے معاشرے میں نیکی کو قبول کرنے اور بہتر قیادت کو آگے لانے کے لئے قربانی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

اس وقت ہمارا معاشرہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے انحطاط سے دوچار ہے، اس میں بُرائی کو قبول کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے، لیکن نیکی کو اختیار کرنے کی استعداد نہیں ہے اس کے متعدد اسباب ہیں اس کا ایک سبب یہ ہے کہ معاشرہ میں صالح بننے سے پہلے ہی انقلابی، جہادی اور تبدیلی نظام کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں، جو معاشرہ کو نہ تو دینی اعتبار سے سنبھالنے اور انہیں بہتر مسلمان بنانے کے اہل ہوتی ہیں اور نہ ہی یہ مقصد ان کے پیش نظر ہوتا ہے، اگر یہ مقصد پیش نظر ہوتا تو اول تو وہ خود صالح پن کے مراحل سے گزرتی، لیکن چونکہ یہ کام نہایت کٹھن کام ہے، اس لئے وہ اس طرف آنے کے لئے تیار نہیں۔

دینی خدمت کے نام پر معاشرہ کی حقیقی اصلاح نہ ہونے اور بُرائی کی قوتوں کے تیزی سے کام کرنے کی وجہ سے ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے شدید بحران سے دوچار ہے۔

ٹائم مینجمنٹ

ٹائم مینجمنٹ ایک ایسا عمل ہے جس کے تحت آپ وقت کا استعمال صحیح طریقہ کار کے تحت کر پاتے ہیں اور وقت کی بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے ہی آپ جان پاتے ہیں کہ دن بھر میں کس سرگرمی پر آپ نے کتنا وقت صرف کرنا ہے؟

بہتر ٹائم مینجمنٹ آپ کو کم وقت میں زیادہ کام مکمل کرنے کے قابل بناتی ہے اور ساتھ ہی زندگی سے تناؤ کم کرتے ہوئے کیریئر کی کامیابی کا باعث بن سکتی ہے۔ ٹائم مینجمنٹ آپ کو روزمرہ زندگی گزارنے کے لیے اضافی وقت فراہم کرتی ہے جسے آپ اپنے پسندیدہ مشغلوں اور اہم کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ ایسے افراد جو اپنے وقت کو بہترین طریقے سے مینیج کر لیتے ہیں وہ زندگی کے لیے تعین کردہ اہداف کو کم عرصے میں ہی حاصل کر لیتے ہیں۔

ٹائم مینجمنٹ کے اصول

ٹائم مینجمنٹ سے حاصل ہونے والے فوائد جاننے کے بعد ضروری ہے کہ ان اصولوں پر بھی بات کی جائے جن کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کر زیادہ سے زیادہ کامیاں حاصل کی جا سکیں۔

صحیح اہداف کا تعین

زندگی میں قابل حصول اور قابل پیمائش اہداف کا تعین کریں جس کے لیے اسمارٹ طریقہ کار اپنائیں۔ مثلاً اس بات کو یقینی بنائیں کہ جن اہداف کا تعین آپ کر رہے ہیں وہ خاص ہونے کے ساتھ ساتھ قابل پیمائش، قابل حصول باموقع اور جدید بھی ہیں۔

عقلمندانہ ترجیحات

روزمرہ کیے جانے والے کاموں کو اہمیت اور عجلت کی بنیاد پر ترجیح دیں مثلاً روزمرہ کاموں پر غور کریں اور دیکھیں کہ اہم اور ضروری کام کون سا ہے: انہیں فوری کرنا ہے؟ اہم

لیکن فوری ضروری نہیں: انہیں کب کرنا ہے؟ اشد ضروری لیکن غیر اہم: اگر ممکن ہو تو سرانجام دیں، غیر ضروری اور غیر اہم: بعد میں کرنے کے لیے ان کو ایک طرف رکھ دیں۔

وقت مقرر کریں

کسی بھی کام کے لیے وقت کا تقرر آپ کو زیادہ مؤثر اور زیادہ توجہ کے قابل بناتا ہے۔ کس کام کے لیے آپ کو کتنا وقت درکار ہوگا یہ چھوٹی سی اضافی کوشش آپ کے لیے بہت سی امکانی مشکلات پیدا ہونے سے پہلے انہیں جاننے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مختلف کاموں کے مابین وقفہ لیں۔ جب بہت سارے کام بغیر کسی وقفے کے ایک ساتھ انجام دیے جائیں تو انسان کے لیے توجہ مرکوز رکھنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے، کاموں کے لیے درمیان مختصر سا وقفہ آپ کو فریش کرنے اور زیادہ توجہ مرکوز رکھنے کے قابل بنائے گا۔ مختصر ہی سہی نیپ ٹائمنگ پر غور کریں اس دوران واک کے لیے جائیں۔ اپنی ذات کو منظم کریں۔ بیڈروم کلینڈر کو طویل مدتی ٹائم مینجمنٹ کے طور پر استعمال کریں، کلینڈر پر ہر منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک تاریخ منتخب کریں یا پھر مکمل منصوبوں کی آخری تاریخ کا انتخاب کریں۔ اس بارے میں سوچنا شروع کریں کہ مخصوص کاموں کی تکمیل کے لیے کون سا دن اور وقت مناسب ہے۔

انسان کو زندگی میں حاصل ہونے والی کوئی کامیابی وقت کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں، اگر آپ اپنی زندگی میں امور کو کل کروں گا یا کروں گی پر ٹالنے والے شخص ہیں تو آپ کا طرز زندگی تبدیلی کا مطالبہ کر رہا ہے اور وہ تبدیلی ٹائم مینجمنٹ ہے۔ ٹائم مینجمنٹ ایسی تبدیلی ہے جو کسی زندگی میں آجائے تو اسے دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی کی کئی منزلیں آرام سے طے کروا دیتی ہے۔

لوگوں کی اکثریت کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ وقت کتنا قیمتی ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ زندگی ایک بار ملی ہے اور اس میں بھی آدھی زندگی گزرنے کے بعد جا کر شعور ملا اور یہ شعور ملنے کے بعد بھی یہ نہیں دیکھا کہ وقت کو کہاں استعمال کرنا ہے۔ انسان جس طرح پیسے

کے متعلق سوچتا ہے کہ اسے کہاں خرچ کرنا ہے، اس کا بہتر استعمال کیسے کرنا ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھانا ہے، اسی طرح اسے چاہیے کہ وقت کی اہمیت کو بھی جانے۔ اگر ایک شخص ٹھان لے کہ اسے اپنا وقت قابو کرنا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے تو وہ کم وقت میں زیادہ کام کرنے کا ہنر سیکھ سکتا ہے۔

ہر انسان کو برابر کا وقت ملتا ہے

قدرت ہر شخص کو دن بھر میں 1440 منٹ، ہفتے میں سات دن، مہینے میں تیس دن اور سال میں 365 دن دیتی ہے، یعنی ہر ایک کو برابر کا وقت ملتا ہے۔ لیکن ہر ایک کا استعمال مختلف ہوتا ہے۔ لوگوں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو بہت مصروف ہوتا ہے۔ وہ بہت خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف ایک ایسا طبقہ بھی ہے جس کا وقت گزرتا ہی نہیں۔ ایسے لوگ اپنا وقت ٹی وی دیکھ کر، سو کر، سوشل میڈیا پر یا آوارہ گردی میں گزار دیتے ہیں۔ جو شخص تنظیم وقت کرنا چاہتا ہے، وہ سب سے پہلے یہ دیکھے کہ مجھ سے اپنا وقت کیوں قابو نہیں ہو رہا۔ سب سے پہلے وہ اس کی فہرست بنائے۔ جب فہرست بنے گی تو بہت سے ایسے کام نکلیں گے جو اس کے وقت کے ضیاع کا باعث بن رہے ہوں گے۔

پرائم ٹائم

ہر شخص کے چوبیس گھنٹوں میں کچھ وقت اس کا ''پرائم ٹائم'' ہوتا ہے۔ پرائم ٹائم وہ وقت کہلاتا ہے کہ جب آدمی کم وقت میں زیادہ معیار اور زیادہ مقدار کا کام کر سکتا ہے۔ مختلف افراد کیلئے پرائم ٹائم مختلف ہوتا ہے۔ کئی لوگوں کیلئے صبح سویرے کا وقت بہتر ہوتا ہے تو بعض لوگوں کیلئے رات کا۔ تاہم، اسلامی فلسفے کے مطابق، کام کرنے کا بہترین وقت تہجد سے لے کر زوال تک کا وقت ہے۔ قرآن میں بھی ہے کہ ہم دن کو کام کرنے کیلئے اور رات کو آرام کیلئے

بنایا ہے۔ اس حوالے سے دنیا کے کامیاب ترین اور امیر ترین افراد کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ دیر سے سوتے ہیں اور جلد اٹھتے ہیں۔ امریکا میں کی گئی تحقیقات کے مطابق، عموما دنیا کے امیر ترین افراد صبح تین سے چار بجے اٹھ جاتے ہیں اور پھر نہیں سوتے۔ بانظر غائر دیکھا جائے تو یہی فطری طریقہ ہے۔

بہر کیف، اپنے پرائم ٹائم کو جانچ کر اس کے مطابق اپنے کاموں کو ترتیب دیجیے۔ آپ کا جو بھی پرائم ٹائم ہے، اس میں وہ کام کیجیے جو آپ کی زیادہ توجہ مانگتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے کام جو نسبتا کم توانائی اور توجہ کے طالب ہیں۔ اگر آپ پرائم ٹائم میں کم تر توجہ کا کام کریں گے تو باقی وقت میں زیادہ توجہ کا طالب کام کرنا پڑے گا۔ یوں، آپ کا وقت زیادہ لگے گا، مگر نتیجہ کم تر ہو گا۔

بڑی تعداد میں لوگ اپنی دفتری زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف، ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنی ذاتی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی فیملی کو ہی اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو اپنی زندگی کا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جس قسم کی زندگی کو اصل سمجھتے ہیں، وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اس میں گزارتے ہیں۔

جو نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کی بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ ہم جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوں گے، ہمیں فوراً جاب مل جائے گی، پھر ہمیں زیادہ وقت مل پائے گا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ جاب ملنے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔ ڈگری لینے کے بعد جو نوجوان جاب کا انتظار کرتے ہیں، ان میں نوے فیصد جاب ملنے تک فارغ رہتے ہیں، حالانکہ انہیں چاہیے کہ اس دوران وہ کوئی ایسا کام کریں جس میں بے شک تنخواہ کم ہو، معیار بھی وہ نہ ہو، مگر اس سے انہیں سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ انسان بنیاد کو نہیں دیکھتا وہ بلندی کو دیکھتا ہے جبکہ بلندی کیلئے بنیاد کی مضبوطی ضروری ہے۔

ایک خاص روٹین کے ساتھ کام کرنے والوں کیلئے ٹائم مینجمنٹ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ نو اور پانچ کے پھیرے میں رہتے ہیں ۔ انہیں اپنے وقت کو ترتیب اور تنظیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ واضح رہے، ٹائم مینجمنٹ ان افراد کا مسئلہ ہے جو وقت کی کمی کا احساس رکھتے ہیں، جو اپنی ایک زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، جو اپنے معمولی اوقات کو غیر معمولی نتائج میں بدلنے کیلئے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ جو اپنے اندر سوئے جن کو جگا چکے ہیں اور اب اس جن سے کام لینا چاہتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو پھر کام زیادہ ہوتا ہے اور وقت بہت کم۔

جو لوگ سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں اور اپنے اندی تبدیلی کی لچک پیدا کر لیتے ہیں، ان کی ٹائم مینجمنٹ اچھی ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے بہ حیثیت قوم، ہم سیکھنے کو اہم نہیں سمجھتے۔ سیکھنے کیلئے کتاب کا مطالعہ اور حالات کا مشاہدہ اہم ذرائع ہیں۔ دنیا کے ذہین لوگ اپنی زندگی کی بد قسمتی اور خوش قسمتی کو معنی دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی زبانوں پر ہر وقت گلہ شکوہ اور پچھتاوا رہتا ہے، یہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ وقت کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ مجھے ایک یونانی کہانی یاد آگئی جس میں ہے کہ ایک شخص جب مرنے لگا تو اس کے سامنے تین لوگ آگئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ تم ہمارے مجرم ہو۔ مرنے والے نے کہا، تم کون ہو، میں تمہیں نہیں جانتا۔ ان تینوں نے جواب دینا شروع کیا۔ ان میں سے پہلے نے کہا، میں وہ وقت ہوں جو تمہیں ملا تھا لیکن تم نے مجھے ضائع کر دیا۔ دوسرے نے کہا، میں وہ توانائی ہوں جو تمہیں ملی تھی لیکن تم نے مجھے ضائع کر دیا۔ تیسرے نے کہا، ہم وہ ذرائع ہیں جو مالک نے بہانے بہانے سے تمہیں دیئے مگر تم نے ہمیں ضائع کیا۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ مرنے کے بعد انسان سے دنیا کے بارے میں پانچ سوال کیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہوگا کہ اپنے وقت کیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہوگا کہ اپنے وقت کو کیسے استعمال کیا۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مواقعوں کو ضائع کرتا ہے تو پھر یہی مواقع اس کے آخری وقت پر عذاب کی صورت

اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا، وقت کو درست طریقے سے استعمال کرنا بہت ضروری ہے اور اس کیلئے ٹائم مینجمنٹ کی مہارت کا سیکھنا لازمی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک کے لوگ اپنی چھٹی کو بھی پلان کرتے ہیں جبکہ ہم چھٹی والے دن لمبی تان کر سو جاتے ہیں اور پھر پورا دن برباد ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے، زندگی میں قانون قدرت کے تحت ''چھٹی'' کبھی نہیں ہے، صرف کاموں کی تبدیلی ہے۔ یہ زندگی اللہ تعالیٰ کا تحفہ ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا درست استعمال کرنا چاہیے۔ وقت اللہ تعالیٰ کا تحفہ اور انعام ہے۔ اس کو صحیح طریقے سے مینج کرنا چاہیے تاکہ زندگی میں آسانی پیدا ہو۔

اگر سیکھنے کی جستجو ہے تو انسان کی شخصیت تر و تازہ ہے۔ اگر سیکھنے کی جستجو ہے تو انسان کی شخصیت میں چمک ہے۔ سیکھنے والا ہر وقت کھوج اور تلاش میں رہتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق جن لوگوں کو سیکھنے کا شوق ہوتا ہے، ان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ جب انسان یہ کہتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تو پھر اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب اس کا جینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کہتا ہے کہ اگر آدمی نے کچھ کر کے دکھانا ہو تو اس کیلئے ایک زندگی کافی ہے، وگرنہ پانچ سو زندگیاں بھی مل جائیں تو وہ کچھ کر کے نہیں دکھا سکے گا۔

از تحریر: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

یونیورسٹیوں اور مدارس دینیہ کے ذرائع آمدن

دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی آف آکسفور برطانیہ، یونیورسٹی آف کیمبرج برطانیہ، میساچیوسٹس انسٹیٹوٹ آف ٹیکنالوجی امریکہ، ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ، اسٹینفورڈ یونیورسٹی امریکہ، ای ٹی ایچ زیورخ سویٹزرلینڈ وغیرہ شامل ہیں۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کی اکثریت مغربی ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہے۔ ٹائمز ہائیر ایجوکیشن کی یونیورسٹیوں کی 2024 کی عالمی رینکنگ کے مطابق دنیا کی سو بہترین یونیورسٹیوں میں سے کوئی ایک بھی اسلامی ملک میں موجود نہیں۔ یہ یقیناً ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ عصری سائنسی علوم و تحقیق میں بہت پیچھے ہے۔

مغربی ممالک میں موجود دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں جو عصری سائنسی تعلیم فراہم کی جاتی ہے اس سے جو انسانی ذہن تشکیل پاتا ہے اس کے رگ وپے میں مادیت پرستی چھائی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مخلص سائنسدان اور محققین انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے اپنی زندگیاں کھپا دیتے ہیں مگر عوام کی اکثریت دنیاوی اسباب، مادیت پرستی، اور پیٹ بھرنے کے لیے ہی ان یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جتنی بہترین یونیورسٹی ہوگی اس کا سائنسی تحقیق، تدریس، اور تعلیم کا معیار اعلیٰ ہوگا۔ نیز جیسے جیسے ہم یونیورسٹیوں کی رینکنگ کی حساب کے نیچے آئیں گے، ہمیں ان یونیورسٹیوں میں سہولیات کا فقدان اور سائنسی تحقیق وتدریس کے معیار میں تنزلی محسوس ہوگی۔

یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے عالمی سطح پر کئی گورننس ماڈلز پر موجود ہیں جن میں پبلک سیکٹر کی یونیورسٹیاں، پرائیوٹ سیکٹر کی یونیورسٹیاں اور سیمی پرائیوٹ سیکٹر کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ عمومی طور پر ان یونیورسٹیوں کے ذرائع آمدن کے لیے کئی طریقہ کار اختیار کیے جاتے

ہیں جو کہ ان کے گورننس ماڈلز پر انحصار کرتے ہیں مگر ہم یہاں عمومی طور پر یونیورسٹیوں کے ذرائع آمدن کا ذکر کرتے ہیں۔ اول ان یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے حکومتیں ایک خطیر رقم فراہم کرتی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کو اس خطیر رقم کا ایک معتد بہ حصہ ملکی یعنی وفاقی حکومت کی جانب سے ملتا ہے اور کچھ حصہ مقامی وعلاقائی حکومت کی جانب سے ملتا ہے۔ ملکی وعلاقائی حکومتوں کی جانب سے یونیورسٹیوں کو جاری ہونے والے فنڈ کی مقدار کئی عوامل پر انحصار کرتی ہے جن میں ان یونیورسٹیوں کی کارکردگی، ملکی وعلاقائی سیاست، تدریس و تحقیق کا معیار، طلبائے کرام واساتذہ کی تعداد، یونیورسٹی کا حجم وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا ذریعہ آمدن ان یونیورسٹیوں کا طلبائے کرام سے بھاری رقم فیس وصول کرکے ہوتا ہے۔ پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کی فیس کم ہوتی ہے جبکہ پرائیوٹ سیکٹر کی یونیورسٹیوں کی بھاری بھرکم فیس ہوتی ہے۔ میساچیوسٹس انسٹیٹوٹ آف ٹیکنالوجی امریکہ کی ایک طالبعلم کے ایک سال کے اخراجات (ٹیوشن فیس، ہاسٹل، کھانے پینے، کتب وغیرہ) تقریباً چھیاسی ہزار امریکی ڈالر ہوتے ہیں جن میں سے باسٹھ ہزار امریکی ڈالر (تقریباً دوکڑور چالیس لاکھ پاکستانی روپے) سالانہ صرف فیس کی مد میں ہیں۔

تیسرا ذریعہ آمدن یونیورسٹیوں کا پروجیکٹس فنڈنگ کی مد سے آتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں سائنسدان اور محققین عالمی اور قومی سائنسی تحقیق کے فنڈنگ کے اداروں میں تحقیق کے لیے ریسرچ پروجیکٹ پروپوزل جمع کرواتے ہیں۔ ان ریسرچ پروپوزل کے منظور ہونے پر سائنسدان اور محققین کو بہت بڑی رقم ملتی ہے جس میں کچھ فیصد رقم یونیورسٹی کے انتظامی اخراجات کے لیے وقف ہوتی ہے اور باقی رقم اس سائنسدان اور ریسرچر کو تحقیق کرنے کے لیے مہیا کی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ سائنسدان اور محقق ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کے طلباء رکھتا ہے، ان کی فیس اور اسکالرشپ دیتا ہے۔ نیز اسی رقم سے پوسٹ ڈاکٹریٹ، ریسرچ فیلو اور ایڈمن اسٹاف بھی رکھا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کے لیے کمپیوٹرز، لیبارٹری اور اس میں موجود

مشینیں و آلات بھی کسی حد تک اسی رقم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ نیز سائنسی تحقیقی مقالوں کو عالمی سائنسی کانفرنسوں میں پیش کرنا اور ان کانفرنسوں میں شامل ہونے کے لیے سفر سمیت تمام اخراجات بھی اسی مد سے آتے ہیں۔

چوتھا ذریعہ آمدن بعض یونیورسٹوں میں اس طرح ہوتا ہے کہ سائنسدانوں، محققین اور ریسرچ فیلوز کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنی تنخواہ کے کچھ فیصد حصے کا بندوبست خود کریں یعنی سائنسدان و محققین خود فنڈنگ لے کر آئیں جس سے ان کی تنخواہ ادا کی جائے۔ گو کہ یہ طریقہ کار اتنا پائیدار اور دیر پا نہیں ہوتا اور اس ماڈل پر جاب کرنے والے سائنسدان اور محققین کوشش کرتے ہیں کہ جلد از جلد پکی جاب حاصل کریں مگر یہ طریقہ آمدن ابھی بھی بعض یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔

پانچوں ذریعہ آمدن یونیورسٹیوں کا انٹیلیکچول پراپرٹی Intellectual Property یعنی فکری ملکیت سے ہونے والی آمدنی سے وغیرہ سے ہوتا ہے جس میں سند حق ایجاد یعنی پینٹ Patent، حق تصنیف، کاپی رائٹ، ٹریڈ مارکس، ٹریڈ سیکرٹ، سافٹ، ویئر، ڈیزائن رائٹ وغیر ہونے والی آمدنی بھی شامل ہے۔ انٹیلیکچول پراپرٹی سے ہونے والی آمدنی کے بارے میں یونیورسٹیوں کی پالیسی مختلف ہوتی ہیں مثلا اگر ایک انٹیلیکچول پراپرٹی (ایجاد) سے ایک لاکھ یورو کی آمدنی ہوئی تو اس ایجاد کو بنانے والے سائنسدان کو ستر فیصد حصہ، جبکہ یونیورسٹی کو تیس فیصد حصہ ملے گا۔ اگر ایک اپنی کھول پراپرٹی (ایجاد) سے آمدنی چار لاکھ یورو سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس ایجاد کو بنانے والے سائنسدان کو چالیس فیصد حصہ، جبکہ یونیورسٹی کو ساٹھ فیصد حصہ ملے گا۔ اسی طریقے سے یونیورسٹی کے سائنسدان اور محققین اگر کوئی سائنسی تحقیقی کام کرتے ہیں جس کو کمرشلائز کرنا ہو تو اسپین آؤٹ کمپنی Spinout Company بنائی جاتی ہے جس میں یونیورسٹی کا شیئر ہوتا ہے۔ مثلا یونیورسٹی آف آکسفورڈ برطانیہ کے سائنسدانوں اور محققین نے کرونا ویکسین بنائی اور اس بنانے کے نتیجے میں یونیورسٹی آف

آکسفورڈ برطانیہ کو خطیر رقم آمدن کی مد میں چھٹا ذریعہ آمدن یونیورسٹیوں کا اپنی خدمات اور پراپرٹی کو دے کر پیسے کمانا ہوتا ہے۔ ساتواں ذریعہ آمدن ان یونیورسٹیوں کا دنیا بھر سے طلباء کو اپنے پاس بلا کر داخلہ دینا ہوتا ہے۔ امریکہ و برطانیہ ہی کی مثال لے لیجیے، ان دونوں ملکوں کی بعض یونیورسٹیوں کے وفود ہر سال ترقی پذیر ممالک جن میں ایشیائی ممالک، خلیجی ممالک، اور افریقی ممالک شامل ہیں، کا بالخصوص دورہ کرتے ہیں اور وہاں کے امیر گھرانوں کے بچوں کو انتہائی مہنگی فیس کے عوض اپنی یونیورسٹیوں میں داخلہ دیتے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کی رپورٹ کے مطابق سال 2022 اور 2023 کے اندر تقریبا ساڑھے سات لاکھ بین الاقوامی طلباء نے برطانوی یونیورسٹیوں میں پڑھا جن میں پچانوے ہزار یورپی ممالک سے تعلق رکھتے تھے جبکہ چھ لاکھ ساٹھ ہزار طلباء یورپ کے باہر سے تھے۔ وہ چار ممالک جنھوں نے سب سے زیادہ طلباء برطانیہ بھیجے ان میں انڈیا نے 126000، چین نے، 102795 نائجیریا نے 53790، اور پاکستان نے 24950 طلباء بھیجے۔

اسی طریقے سے اور بھی کئی ذرائع ہوتے ہیں جن کی مدد سے یونیورسٹیاں اپنے ذرائع آمدن بڑھتا ہیں جن میں اینڈومنٹ فنڈ Endowment Fund اور اوقاف، اور ڈونیشن یا عطیات شامل ہیں۔ دنیا کے کھرب پتی افراد اور ان کے رفاہی ادارے یونیورسٹیوں کی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہوتے ہیں مثلا برطانوی ارب پتی سرڈیوڈ ہارڈنگ Sir david Herdling نے 2019 میں سو ملین برطانوی پاؤنڈ یونیورسٹی آف کیمبرج برطانیہ کو سو کے قریب پی ایچ ڈی طلباء رکھنے کے لیے عطیہ کیے غرض عصری تعلیمی اداروں اور بالخصوص دنیا کے یونیورسٹیوں میں ذرائع آمدن کے لیے باقاعدہ ڈیپارٹمنٹ موجود ہوتے ہیں جو کہ آمدنی کو بڑھانے کے لیے کوششیں کرتی رہتے ہیں۔

راقم نے بھی چونکہ انہی عصری تعلیمی اداروں سے سائنسی تعلیم حاصل کی ہے اور اپنی زندگی انہی یونیورسٹیوں میں پڑھتے پڑھاتے گزاری ہے لہذا ذہن میں اکثر یہ خیال آیا کہ کیوں

نہ مدارس دینیہ کو بھی اسی یونیورسٹی ماڈل پر ڈھالا جائے؟ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے اکابرین امت اور مفتیان کرام کو جنھوں نے راقم کی صحیح سمت رہنمائی کی اور واضح کیا کہ میرا یہ خیال غلط ہے اور خلط مبحث ہے۔

علمائے کرام کی صحیح دینی رہنمائی کے حوالے سے کچھ واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ کوئی 1998 کا زمانہ ہوگا جب راقم کالج جاتا تھا، اس وقت مدنی مسجد کراچی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مغرب کے بیان میں جو بات کانوں میں پڑی وہ یہ کہ ''اللہ سے ہوتا ہے، اللہ کے غیر سے کچھ نہیں ہوتا۔ ڈگری، پیسہ، مال و دولت، ان سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف اللہ سے ہوتا ہے۔ الحمدللہ پھر علمائے کرام سے تعلق مزید گہرا ہوا اور اللہ نے توفیق دی کہ اکابرین امت اور صحابہ کرام کے واقعات پڑھوں جن میں جابجا اللہ کے خزانوں سے براو راست لینے کے واقعات کا ذکر آیا ہے۔ پھر جب کمپیوٹر سسٹم انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران 2002 میں چھٹیوں میں چلے پر جانا ہوا تو رائے ونڈ سے فارغ علمائے کرام کے ساتھ وقت لگانے کا موقع ملا۔ یہ دو نوجوان علمائے کرام سال کی تشکیل پر تھے اور ان کے ساتھ پندرہ دن کی تشکیل دی۔ انہی میں سے ایک نوجوان عالم کو جماعت کا امیر بھی متعین کیا گیا تھا۔ ایک دن راقم کو ایک اور ساتھی کے ساتھ خدمت (کھانا پکانے) کی ذمہ داری دی گئی۔ الحمدللہ دوپہر کا کھانا پوری جماعت کے لیے تیار ہونے والا تھا کہ امیر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ کچھ مزید ساتھی کھانے میں شریک ہوں گے۔ اب راقم بہت پریشان ہوا کہ کھانا تو اتنے افراد کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ فرمایا کہ بھائی کھانا پکاتے ہوئے سورۃ یسین پڑھو اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے مدد طلب کرو، اللہ پاک کھانے میں برکت دے گا۔ اب ہم جیسے دنیادار انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلباء کو علمائے کرام نہ صرف یہ کہ رکوع الی اللہ کی ترغیب دے رہے ہیں بلکہ عملی مشق کے ذریعہ اللہ کے خزانوں سے لینے کا طریقہ تلقین کر رہے ہیں۔ اسی طریقے سے تبلیغی مرکز رائے ونڈ جانا ہوا تو وہاں تبلیغی مرکز کی بے سروسامانی دیکھ کر کئی خیالات آئے کہ

کیوں یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں اور شان و شوکت اختیار نہیں کرتے؟ یہ بھی خیال آیا کہ کیوں یہ دین کی دعوت کو سینہ بہ سینہ پھیلانے کی ترغیب دیتے ہیں؟ یعنی ایک طرف باطل قوتیں اور کفار اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ہیں، دنیاوی اسباب سے لدے ہوئے اور دوسری طرف یہ ترغیب دی جارہی ہے کہ اللہ کی ذات پر توکل کیا جائے، اسباب کو اسباب کے درجے میں رکھ کر محنت کی جائے اور رجوع الی اللہ کیا جائے۔ وہاں پر موجود تبلیغی ساتھیوں نے ذہن کو صاف کیا کہ ہماری نظر مادی اسباب پر نہیں ہونا چاہیے، اسباب کا انکار نہیں مگر نظر مسبب الاسباب پر ہونی چاہیے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب مغرب کی　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اسی طرح مدارس دینیہ جانے اور اکابرین کے بیانات سننے کا اتفاق ہوتا رہا جن میں حکیم اختر رحمہ اللہ علیہ کی مجالس، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی اتوار کی مجالس وغیرہ شامل ہیں۔ نیز حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک سال عصر تا عشاء گزارنے کی بھی توفیق ملی۔ انہی حضرات کی تھوڑی باتیں سننے کا یہ نتیجہ نکالا کہ ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ مدارس دینیہ براہ راست اللہ کی مدد سے چلتے ہیں اور مسلمانوں کو مغربی علوم، سائنس و ٹیکنالوجی اور جدیدیت سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

پھر اکابرین ہی کی رائے اور مشورہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری فرانس سے حاصل کی اور سائنسی علوم و ٹیکنالوجی میں اپنا لوہا منوا کر دنیا کے بہترین سائنسدانوں میں تین مرتبہ اپنا نام شامل کروایا الحمدللہ اور ابھی بھی کمپیوٹر سائنس کی دنیا میں عالمی معیار کی سائنسی تحقیق کرکے مسلمانوں کا لوہا منوا رہا ہوں۔ قارئین یاد رکھیئے کہ راقم ایک کمپیوٹر سائنسدان ہے اور دنیادار

بندہ ہے اور جب مادیت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے اکتا جاتا ہے تو تقویٰ وعلمیت کے حصول کے لیے مدارس مدینیہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ صرف میرا مسئلہ نہیں بلکہ جتنے بھی ہم جیسے دنیادار لوگ ہیں، ان کو مدارس دینیہ اور علمائے کرام سے ہی رہنمائی ملتی ہے۔ ہم جیسے دنیا دار لوگوں کے دلوں پر جب دنیا کی محبت، مادیت پرستی، عقل پرستی، اور جدیدیت کا اثر ہونے لگتا ہے تو جائے پناہ یہی مدارس دینیہ ہوتے ہیں عجیب بات یہ ہے کہ اب بعض علمائے کرام اور مدارس درینیہ کی ہی طرف سے مادیت، جدیدیت، اور اسباب پر نظر رکھنے کی دعوت اور عملی ترغیب دی جاری ہے تو ہم جیسا دنیادار طبقہ کہاں جائے اور کہاں سے روحانیت، علمیت، توکل علی اللہ حاصل کریں؟

آسان الفاظ میں جدیدیت اور مغربی افکار سے متاثر بعض لوگ کچھ مدارس دینیہ کی فکری رہنمائی کررہے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کے عنوان سے کررہے ہیں۔ ان کا مطمح نظر یہ ہے جس طریقے سے مغربی یونیورسٹیوں میں آمدن کے مختلف ذرائع ہیں، یہی کچھ ذرائع مدارس دینیہ کو بھی اختیار کر لینے چاہیے۔ مثلاً مدارس دینیہ کے ذرائع آمدن سے متعلق یہ کہا جارہا ہے کہ :

''مدارس دینیہ کو اپنے ذرائع آمدن کے لیے چار ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ پہلا ذریعہ یہ کہ جو مدارس کے طلباء اپنے اخراجات خود برداشت کرسکتے ہیں ان کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنے اخراجات دیں۔ مدارس اس کی تحقیق کریں کہ جو بچے کھاتے پیتے ہیں ان کو بتائیں کہ وہ اپنا خرچہ خود برداشت کریں۔ ہمارے دین میں یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ آپ کسی پر بوجھ بن جائیں۔ جب مدرسے پر خرچہ زیادہ بڑھتا ہے تو مدرسے کی تعلیم کی کوالٹی گرجاتی ہے، اساتذہ کی تنخواہیں رہ جاتی ہیں اور پھر مہتمم سارے اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر اسی مانگنے پر لگا ہوا ہوتا ہے۔ دوسرا ذریعہ یہ کہ مدارس کے پاس انڈومنٹ فنڈ اور اوقاف ہونے چاہیں۔ تیسرا ذریعہ یہ کہ مدرسے کے اساتذہ اپنی خدمات لوگوں کو فراہم کرکے آمدن مدرسے میں لے کر آئیں۔ یہ

اساتذہ ٹریننگ دیں اور اس کی فیس وصول کریں، اپنی کمپنیاں بنائیں۔ اور چوتھا ذریعہ ڈونیشن اور عطیات کا ہونا چاہیے۔''

یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور دل خون کے آنسو روتا ہے کہ جنھوں نے اُمت مسلمہ کی نظریاتی وعملی رہنمائی کرنی تھی، جنھوں نے لوگوں کی نظریں اسباب سے ہٹا کر مسبب الاسباب کی طرف پھیرنی تھیں، جنھوں نے تصاب اختیار کرنا تھا، جنھوں نے اکابرین کے طریقہ کار کو عملی طور پر اختیار کرکے ہم جیسے دنیادار لوگوں کے لیے عملی مثال بنا تھا، اب وہی لوگ دنیاوی اسباب اختیار کرنے کی تلقین کررہے ہیں، اب وہی لوگ جدیدیت سے متاثر ہوگئے ہیں، اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

بقول شاعر

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک   نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

غرض یہ تقویٰ، اخلاص، للہیت اور تربیت ظاہر و باطن ہی ہے جو کہ ان مدارس دینیہ کا خاصہ ہے۔ اب اگر یہ اخلاق، تقویٰ اور للہیت مدارس دینیہ سے عنقا کردی جائے تو عصری علوم کے اداروں سے فراغت حاصل کرنے والوں اور مدارس دینیہ سے فارغ علمائے کرام میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اور کس طریقے سے ان دینی مدارس سے فارغ علمائے کرام معاشرے میں سدھار پیدا کرسکیں گے؟ اور پھر کس طریقے سے ان دینی مدارس سے فارغ علمائے کرام اسلام اور ملک وملت کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دیں گے؟ نیز پھر ان مدارس سے فارغ ہونے والوں میں اور مغربی ممالک کے لادینی عصری اداروں سے دینی اسلامی تعلیم حاصل کرنے والوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟ غرض یہ مدارس دینیہ ہی ہیں جو کہ دین کو اپنی اصل شکل میں قائم رکھنے میں معاون ومددگار ہیں۔ مسلمانوں کو کمزور اور ختم کرنے کیلئے باطل کی چالوں میں سے ایک چال یہ ہے کہ کسی طریقے سے مدارس دینیہ کو کمزور اور ختم کردیا جائے اور اس کے لیے جو عملی صورت اختیار کی جارہی ہے وہ یہ کہ ان مدارس دینیہ کو بھی یونیورسٹیوں کی نہج پر

ڈالا جائے۔ ہماری گزارش ہے کہ مدارس دینیہ عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی نقالی کواپنانے کے بجائے اپنی نسیج پر قائم رہیں۔

بقول شاعر

میر کیاسادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لڑکے سے دوالیتے ہیں

دیکھئے مدارس دینیہ کی آمدن سے متعلق اکابرین کی سوچ کچھ یوں تھی۔

''حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں حدیث کے دورے میں ستر ستر طالب علم ہوتے تھے، ان کا کھانا بھی کپڑا بھی ہوتا تھا، مگر کوئی فکر ہی نہیں، نہ چندے کی تحریک، نہ کبھی کسی سے فرمایا، ایک کمرہ بھی نہیں بنوایا، نہ وہاں چندہ تھا نہ کچھ تھا، پھر بھی وہاں خندہ ہی خندہ تھا۔'' (حوالہ: ملفوظات حکیم الامت، جلد 17 حسن العزیز جلد 1، ملفوظ 517، صفحہ 126، ادارہ تالیفات اشرفیہ لاہور)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ، انہوں نے دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے قیام وبقا کے لئے جو دستور العمل تجویز فرمایا، اس میں تحریر ہے کہ:

''اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ ان شاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائی گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔''

(حوالہ: بانی دارالعلوم کادستور عمل، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، صفحہ 153)

جب دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جاچکی تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''عالم مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا، یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔ اس واقعہ کو حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے ذیل کے اشعار میں نظم کیا ہے۔''

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہوجائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یوں سمجھ لینا کہ بے نور وضیا ہوجائے گا

(حوالہ: تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، صفحہ 47)

راقم جب مدارس کی آمدن سے متعلق کچھ لوگوں کی تقریر سنتا ہے اور اکابر کے تحریرات پڑھتا ہے تو تشویش ہوتی ہے۔ کیا مدارس دینیہ کے طلبائے کرام بوجھ ہیں جو مدارس دینیہ کے طلبائے کرام سے فیس وصول کی جائے؟ کیا مدارس دینیہ کے طلبائے کرام مہمان رسول ﷺ نہیں ہیں؟ راقم کو یہ تشویش ہورہی ہے کہ ہمارے اکابرین کا مدارس دینیہ کے حوالے سے یہ طرز عمل نہیں تھا۔ علوم نبوت حاصل کرنے والے طلبائے کرام کا تواکرام کرنا چاہیے۔ مدارس دینیہ تو توکل علی اللہ کی بنیاد پر چلتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اگر آپ لوگ جدیدیت سے اتنے ہی متاثر ہوگئے ہیں کہ یونیورسٹیوں کے نظام آمدن کو اکابر کے منہج سے ہٹ کر مدارس دینیہ کے لیے اختیار کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کیجئے مگر مسلمان عوام کو ''مدارس'' کے عنوان سے دھوکہ میں مت ڈالیے! نیز اگر آپ یونیورسٹیوں کے ذرائع آمدن ہی اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کیا آپ کو اپنے اداروں کے نام سے ''مدرسہ'' اور اکابرین کے نام ونسبت ہٹا دینی چاہیے۔

آخر میں مضمون کا اختتام صدر وفاق حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتم کی گفتگو سے کچھ اقتباس نقل کر کے کرتے ہیں:

''ہمارے مدارس کی بنیاد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے وقت سے ہی اس بات پر ہے کہ یہ پرائیویٹ ادارے ہیں، ان کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہمیں حکومت سے کوئی امداد چاہیے، نہ ہمیں حکومت سے کوئی پیسے چاہئیں، نہ حکومت کی ہمیں مداخلت چاہیے، ہم اپنے طریقہ کار پر جو اکابر کا طریقہ کار چلا آرہا ہے اس کے تحت چلنا چاہتے ہیں، کوئی ایسے ادارے کو ہم اپنے اوپر مسلط نہیں کرنا چاہتے جو ہمارے اندرونی نظام میں دخل اندازی کرے، جو ہمارے طریقہ کار میں مداخلت کرے، جو کسی طرح بھی ہمارے مقاصد پر اثر انداز ہو، مدرسہ کو ہم اس سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم یہ بات واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ کسی حکومت کے ماتحت ہو کر ہم اپنے نصاب و نظام کو جاری نہیں رکھ سکتے، ایسا کرنا ہمارے لئے زہر قاتل ہے، ہم نے ایسا کرنے والوں کے انجام دیکھتے ہیں، ہم نے سعودی عرب میں دیکھا ہے، ہم نے امارات میں دیکھا ہے، مصر میں دیکھا ہے، ہم نے شام میں دیکھا ہے کہ وہاں مدارس کو کس طریقے سے ختم کیا گیا، مدارس کو کسی طریقے سے دبایا گیا، آج وہاں پر کوئی کلمہ حق کہنے والا موجود نہیں ہے، یا ہو تو اس کی جگہ جیل ہوتی ہے یا اس کے اوپر تشدد کیا جاتا ہے۔

الحمدللہ، پاکستان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کے لئے بنایا، اور پاکستان کو درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کا قلعہ بنایا ہے، ہم یہاں یہ صورت حال کسی قیمت برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے مدارس اور ہمارے علماء وہ اس طرح ہو جائیں کہ ان کے سامنے کچھ بھی ہوتا رہے، اور وہ اپنی زبانوں کو بند رکھیں اور شیطان اخرس بن کر زندگی گزاریں۔

حکومتوں کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کسی (ادارہ، شخص) کو گھیرنا ہوتا ہے تو شروع میں ساری پابندیاں عائد نہیں ہوتیں، شروع میں اس کے لئے ایک دانہ ڈالا جاتا ہے، اس کے بعد آگے جا کر اس کو کسی وقت میں گھیرا جاتا ہے، پوری تاریخ میں یہی طریقہ کار رہا ہے۔

ابھی اگرچہ اس (مفاہمتی یادداشت) میں لکھا ہوا ہے کہ اپنے نظام میں آزاد وخود مختار رہیں گے کہ، لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ جب اس دائرے کے اندر آ گئے اور اس میں یہ لفظ موجود ہیں کہ وزارت تعلیم کی طرف سے وقتاً فوقتاً ملنے والی ہدایات کے پابند ہونگے، تو اب آپ دیکھیے آج کسی کی حکومت ہے، کل کسی اور کی حکومت ہوگی، وہ لوگ بھی حکومت میں وزارت تعلیم کے اندآئیں گے، جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مدارس جہالت کی یونیورسٹیاں ہیں، جنہوں نے علی الاعلان یہ بات کہی ہے، جنہوں نے یہ کہا ہے کہ مدارس تو صرف یہ سکھاتے ہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا، گویا مذاق اڑا کر کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا حالات پڑھانے والے مدارس ہیں تو یہ مدارس موجودہ زندگی کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ تو وہ بھی تعلیم کے نظام کے اندر آ سکتے ہیں۔ کل کو کون آتا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا مدارس کو اس دائرے کے اندر لانے کے ہم بالکل سختی کیساتھ مخالف ہیں۔

ہم (یہ جدید معلومات اس الزام کو دور کرنے) کے لیے نہیں پڑھا رہے، جو ساری دنیا یہ نامعقول بات کہتی ہے کہ مدارس سے ڈاکٹر کیوں پیدا نہیں ہوتے، اس سے وکیل Laywer کیوں نہیں پیدا ہوتے، انجینئر کیوں نہیں پیدا ہوتے، مدارس کے فضلاء کسی ملٹری کے اندر کمیشن کیوں نہیں لیتے، اور اس بات کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں مدرسہ کے لوگ کمیشن لے چکے ہیں، وہ بریگیڈیئر بن چکے ہیں، وہ کرنل بن چکے ہیں۔

ارے بھائی! یہ مدرسہ بریگیڈیر اور کرنل پیدا کرنے کے لیے نہیں تھا، یہ قرآن وسنت کا علم محفوظ کرنے کے لیے تھا، یہ عالم پیدا کرنے کے لیے تھا، یہ بتاؤ کہ پورے پاکستان کے اندر کون سے سرکاری ادارے کے اندر اسلام کی تعلیم دی جا رہی ہے؟ کون سے سرکاری ادارے میں حافظ پیدا ہو رہے ہیں ہے؟'' (حوالہ: مدارس رجسٹریشن پر شیخ الاسلام، صدر وفاق مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی وفاق المدارس کی مجلس عاملہ میں گفتگو، 17 دسمبر 2024)۔

اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے طریقے

تخلیقی صلاحیتوں کا حامل بننے میں ہمارے لیے کیا مواقعات ہوتے ہیں؟

۱۔ پیسے کی قلت: دیکھئے طلبا کی اکثریت غریب ہوتی ہے تو وہ دوران تعلیم اور فراغت کے بعد بھی محض اپنی مالی تنگی کو دور کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور غربت امکانات کی دنیا کو محدود کر دیتی ہے، تخلیقی سوچوں پر پہرے بٹھا دیتی ہے، ہمیں کوئی آپشن نہیں ملتا تو امامت یا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں اور جیسے ہی جاب کا کوئی آفر آئی تو اس تدریس کو بھی خیر آباد کہ دیتے ہیں کیوں کہ تدریس میں اچھے پیسے نہیں ملتے، اور مالی پریشانی کا حل نکالے بغیر تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے کے ہزار طریقے بتانا بھی بے سود ہیں، الا یہ کہ پیسوں کی طلب ہی دل سے نکال دی جائے اور قناعت پسندی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے، اس کا حل آٹھویں قسط میں پیش کیا جا چکا ہے۔

۲۔ والدین کی توقعات: بیٹا کچھ اور کرنا چاہ رہا ہے لیکن والدین کچھ اور توقعات لگائے بیٹھے ہیں اور عموما بیٹا والدین کی پسند کو اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔

۳۔ بیوی بچوں کی فکر: شادی سے پہلے ہمارا نوجوان اس لیے پڑھتا ہے کہ اچھا کماؤں گا تو اچھے گھرانے کی بیوی ملے گی اور شادی کے بعد یہ سوچتا ہے کہ اب پڑھائی وڑھائی سے تو میرے بیوی بچوں کا پیٹ بھرے گا نہیں تو پڑھ کے کیا فائدہ۔

۴۔ آئیڈیاز اور تخلیقیت کی ناقدری: میرے ذہن میں کوئی نئی چیز آتی ہے یا میں سوال کرتا ہوں تو اس تجسس وجدت کی قدر کر کے اس کا جواب دینے اور حوصلہ افزائی کے بجائے ڈانٹ دیا جاتا ہے یا پھر یہ کہ دیا جاتا ہے کہ آئندہ آئے گا یا پھر یہ کہ یہ کوئی نئی چیز تھوڑی ہے۔

۵۔ غباوت کا طعنہ: پڑھائے جا رہے فن یا فنون سے دلچسپی نہیں تو اب اس مخصوص فن میں کامیاب نہ ہونے پر ہمیں غبی ہونے کا طعنہ دے دیا جاتا ہے۔

۶۔ کثرت مطالعہ والی ذہنیت: یہ سوچنا کہ جب تک میں ہزاروں کتابیں مطالعہ نہ کر لوں خود سے سوچنا بے کار اور بے سود ہے۔

۷۔ عدم ارتکاز: مختلف خیالات کا ہجوم اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کسی ایک سوچ پر ہم فوکس کر ہی نہیں پاتے اور آئن اسٹائن نے کہا ہے it is not that I m so smart it is just that I stay with problems longer کہ میرے اتنے بڑے کارنامے انجام دینے کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہت اسمارٹ ہوں، بلکہ میں کسی مسئلے اور اس کے حل پر دوسروں سے زیادہ دیر تک سوچتا اور اس پر کام کرتا ہوں۔

تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ہم کیا کریں؟

۱۔ سب سے پہلے اپنے ذہن میں یہ چیز بٹھائیں کہ دنیا کی سب سے قیمتی شئی دماغ کا دیا ہوا آئیڈیا ہے چاہے ہمیں لاکھ نظر آ رہا ہو کہ ہر چیز پیسے سے ہو رہی ہے، لیکن غور کریں کہ صرف سونا ہے جو اللہ جل جلالہ نے پیدا کیا ہے ورنہ تو یہ پیسے یہ کرنسی بھی انسانی دماغ کی پیداوار ہیں، جب ہمیں خلیفۃ ارضی بنایا گیا تو دوسرے حیوانوں اور ہم میں سب سے بڑا فرق یہ رکھا گیا کہ ہمیں دماغ کی انوکھی قوت عطا کی گئی، خود ایمان بھی ایک تصور ایک آئیڈیا ہے جسے میں ناقابل تغلیط و تبدیل سمجھتا ہوں تو وہ میرا عقیدہ وایمان بن جاتا ہے یعنی اسلام کے پانچ ارکان میں بھی اولیت آئیڈیا کو ہی حاصل ہے۔

۲۔ تبدیلی لانے اور کچھ نیا کرنے کا خواب دیکھیں: انگلش کا مقولہ ہے necessity is the mother of invention ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، جب تک ہم تبدیلی کا خواب نہیں دیکھتے اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے جب تک ہم دنیا کو کچھ نیا دینے کی تڑپ اپنے اندر نہیں رکھتے تب تک ہم نہ حقیقی معنوں میں علم

حاصل کر سکتے ہیں نہ اپنے مشن کا تعین کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی ترجیحات کا، بس دوسروں کی سالوں کی محنت نقل کرنے کو ہی اپنی تخلیقیت وصلاحیت کی معراج سمجھ بیٹھیں گے حالاں کہ یہ صرف پہلی سیڑھی ہے۔

۳۔ مقصد اور مقصد تک پہنچانے والے گولز (ذیلی منزلوں) کی تعیین: مقصد اور گول کا فرق اچھی طرح سمجھیں، حصول مقصد کے درمیان کے مختلف پڑاؤ ذیلی مقاصد یا گول کہلاتے ہیں، ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے اس پر ہم مسلمانوں کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ چیز ہمیں قرآن وحدیث سے مل جاتی ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد عبادت ورضائے رب، تبلیغ دین، اپنی اور معاشرے کی دینی ودنیوی مصالح کا حصول اور دینی ودنیوی مفاسد کا دفعیہ اور خدمت اسلام ومسلمان ہونا چاہیے لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے راستے کیا کیا ہو سکتے ہیں، ہم سب سے پہلے ان امکانات کا احصاء کریں اور پھر کسی ایک لائن یا چند لائنوں کو گول بنا کر ان پر محنت شروع کریں۔

۴۔ لائبریری سے دوستی کریں اور تمام فنون پر سرسری نظر ڈالیں: کیوں کہ کتابوں سے مخلص کوئی دوست نہیں ہو سکتا، وہاں جا کر تمام فنون کی چیدہ چیدہ کتابوں کا مطالعہ کریں خواہ ہمیں دلچسپی ہو یا نہ ہو، اور یہ سمجھ کر مطالعہ کریں کہ کتاب ایک روشنی ہے جس سے ہمیں اپنے چراغ کو روشن کرنا ہے تاکہ پھر آگے دوسرے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کو روشن کیا جا سکے گویا ہم ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سر لے رہے ہیں، جب تمام فنون کا مطالعہ کر لیں گے تو خود بخود ہمیں کسی ایک یا چند فنون میں دلچسپی نظر آنے لگے گی۔

۵۔ ذہانت کی گیارہ قسموں میں حصہ لیں: (۱) لسانی ذہانت، (۲) نمبر اور معقولیت والی ذہانت، (۳) تصویری ذہانت، (۴) نغماتی ذہانت، (۵) جسمانی ذہانت، (۶) سماجی ذہانت، (۷) جذباتی ونفسیاتی ذہانت، (۸) طبیعیاتی فطرتی ذہانت، (۹) آئیڈیائی ذہانت، (۱۰) روحانی ذہانت، (۱۱) وجودی ذہانت، (تفصیل پھر کبھی) ان سب میں

حصہ لیں، ان سب کا ٹیسٹ چکھیں پھر جس نوع میں دماغ زیادہ چلے زیادہ لذت ملے اس کا انتخاب کر لیں۔

۶۔ غور وفکر سے دوستی کریں: لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ کریں مگر اس سوچ کے ساتھ کہ یہ ہمیں فکریں عطا کرنے میں محض مددگار ثابت ہو سکتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کا کل انحصار ان پر نہ رکھیں، اگر کتابیں پڑھ کر ہم خود سوچنے کے قابل نہیں ہو پاتے تو پھر کثرت مطالعہ ہمیں سوائے دوسروں کے سامنے اپنی دھاک بٹھانے کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، تصور کریں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں کے زمانے میں کتابیں نہیں تھیں، صرف سوچیں تھیں، تو ہم بھی سوچیں، دن میں کم از کم دو گھنٹے نکالیں ابتداء اور ایک سوچ متعین کریں اور اکیلے بند کمرے میں یا کھلے آسمان کے نیچے چھت پر بیٹھ کر یا گھومتے پھرتے سوچتے رہیں، لیکن ایک ہی چیز پر سوچیں اگرچہ مختلف زاویوں سے کیوں نہ ہو کیوں کہ قوت ارتکاز ہماری سوچوں میں گہرائی پیدا کرتا ہے۔

۷۔ حصول معلومات وتجربات اور ان کی پروسیسنگ کا تناسب ملحوظ رکھیں: معلومات عموما کتابوں سے اور تجربات عموما اپنے بڑوں سے حاصل ہوتے ہیں مگر وہ معلومات وتجربات مفید اور ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے تب ہی بنتے ہیں جب ہم خود ان کا تجزیہ کرتے ہیں ان سے نتائج نکالتے ہیں، لہٰذا مطالعے اور تجربے کے علاوہ ہمارے دن کا تہائی یا چوتھائی حصہ ان معلومات وتجربات پر سوچتے ہوئے گزرنا چاہیے، کیوں کہ دماغ جب مطالعے یا پڑھائی کے وقت فوکس موڈ میں ہوتا ہے تو محدود طور پر سوچتا ہے لیکن جب آرام یا نہانے یا ریلیکس کرتے وقت diffuse موڈ میں ہوتا ہے تو وہ غیر متعلقہ چیزوں کو بھی اس سے متعلق کر دیتا ہے کیوں کہ یہاں حد بندی نہیں ہوتی تو اس وقت زیادہ اچھا سولوشن نکل سکتا ہے، گویا فوکس موڈ میں شعور اور ڈی فیوژ موڈ میں لاشعور کام کر رہا ہوتا ہے گویا درسی اوقات سے زیادہ

اہم خارجی اوقات میں سوچی جانے والی فکریں ہیں کیوں کہ ہمارا زیادہ وقت خارجی ہی ہوتا ہے اس لیے مطالعے اور نتیجۂ مطالعہ پر غور کے لیے خاطر خواہ وقت نکالیں۔

۸۔ منطقی طریق استدلال سیکھیں: اس سلسلے میں استخراجی طریقۂ استدلال deductive reasoning اور استقرائی طریق استدلال inductive reasoning پر اپنی زندگی میں موجود مسائل اور سوچوں کے ذریعے عملی مشق کریں تاکہ استخراج کے ذریعے ہم مسائل کے صحیح تفہیم و تجزیے پر قادر ہو سکیں اور استقراء کے ذریعے ہم امکانات اور آپشنز میں اضافہ کر کے چیزوں کو مختلف زاویوں سے دیکھ سکیں اسی طرح ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان نسبت correlation پر سوال اٹھایا کریں خصوصاً نسبت تلازم وتضاد پر کیوں کہ اکثر ہمارا کامن سینس دو چیزوں کے درمیان تلازم یا تضاد کی نسبت قائم کر لیتا ہے لیکن ڈیپ سینس اور امعان نظر کے بعد وہ تلازمہ یا تضاد فرضی اور سطحی نکل آتا ہے نیز کبھی ہم دو الگ چیزوں کے درمیان تمیز (differentiation) نہیں کر پاتے، کبھی اشیاء کے درمیان صحیح ارتباط (association) نہیں پیدا کر پاتے، کبھی حل کے متعدد امکانات (possibility) کا مکمل احصاء نہیں کر پاتے اپنے ذہنوں میں پہلے سے موجود کسی حد بندی (limitation) کی بنا پر، اسی کو انگلش میں collect and connect اور divergent and convergent thinking کہتے ہیں۔

۹۔ آئیڈیاز سوچتے وقت نہ تو خود تنقید کریں اور نہ کسی تنقیدی دوست کے سامنے پیش کریں: دیکھیں دماغ کے دو حصے میں سائنس کے مطابق دایاں حصہ (hemisphere) آئیڈیائی اور تصوراتی ہے اور بایاں حصہ تجزیاتی اور تنقیدی، ہر ایک کا اپنا کردار واہمیت ہے لیکن جب ہم کسی نئے آئیڈیا پر کام کر رہے ہوں تو اس پر کبھی بائیں حصے کو حاوی نہ ہونے دیں اور نہ کسی تنقید کے شوقین دوست سے اس پر ڈسکس کریں ورنہ ابتداء تنقید ہماری تخلیقیت کو کھا جاتی ہے، پہلے اس فکر کی کھچڑی پکائیں جب پوری پک کر تیار

ہو جائے پھر بائیں دماغ اور تنقید کے شوقین دوستوں کی تنقید سے اس کی تنقیح کریں، تاکہ اس کی خامیاں کھل کر سامنے آئیں اور اسے مزید سنوار سکیں۔

۱۰۔ سوالات قائم کریں: السوال نصف العلم اور غور کریں کہ حضور ﷺ نے اپنے سامنے موجود بچے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تربیت کیسے کی کہ جب وہ چھوٹی عمر میں مجلس نبوی میں بیٹھ کر سوال کرتے تو دیگر صحابہ ان کو ادب اور خاموش رہنے کی نصیحت کرتے مگر حضور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے اور بعد میں عمران کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے لسان سؤول و قلب عقول، تو جب تک ہم سوال کرنے کی عادت نہیں ڈالتے علم ہم سے دور رہے گا، ایک سوال قائم کریں کم از کم تین دن اس پر خود سوچیں۔

۱۱۔ بحث ومباحثے ودعویٰ میں دلچسپی لیں: ہم نے پڑھا، سوچا اور سوالات قائم کیے اب آتا ہے مباحثے کا وقت، یاد رکھیں دعویٰ علم کا بہت اہم جزو ہے، مثلاً مطالعے کے بعد ایک ہائپوتھیسس hypothesis ایک مفروضہ بنانا اور اس کے دلائل ڈھونڈنا اور اس کے قوت وضعف پر بحث کرنا، دنیا کے سب سے بڑے فلسفی سقراط فلسفی اسی وقت شمار کیے گئے جب وہ ایتھنز میں منعقد مجلسوں میں بیٹھ کر صاحبان مجلس سے بحث کرتے اور ان کو لاجواب کر دیتے، مباحثہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے ذہن کو جلا بخشتا ہے، ہماری قابلیت اور غلطیاں ہمارے سامنے لاتا ہے، خود کو کسی مشن یا سوچ سے جوڑے رکھنے کا اس سے اچھا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ اجتماعی طور پر کسی موضوع پر بحث کریں، اسلاف کی آپ بیتیاں اس پر دال ہیں۔

۱۲۔ صاحب ثروت اہل ذوق ساتھیوں سے دوستی کریں: تاکہ اگر ہم اپنی غربت کی وجہ سے کتابیں نہیں خرید پا رہے تو ہماری ذوق کی آبیاری ان کے پاس موجود کتابوں سے ہو سکے ورنہ ہوتا کیا ہے کہ جب ہمارے اندر کسی فن کا شوق ہوتا ہے اور پھر ہمارے ذوق کے مطابق کتابیں نہیں مل پاتیں تو انسان کا ذوق مر جاتا ہے اور ذوق تخلیقیت کی پہلی سیڑھی ہے۔

۱۳۔ کچھ دوست ایسے رکھے جن سے ہم سیکھیں اور کچھ دوست ایسے رکھیں جن کو سکھائیں اور جن کی غلطیوں کی تصحیح کریں: اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاگرد بھی بنیں استاذ بھی بنیں تاکہ افادہ واستفادہ دونوں ساتھ میں ہو کیوں کہ محض سکھانے والا دوست ہمارے اندر خامیاں نکالتا ہے تو ہو سکتا ہے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کردے اور محض سیکھنے والا دوست ہمارے اندر ایک مثبت چیز یہ پیدا کرتا ہے کہ تصحیح اور خامیاں نکالنے کے صدقے ہمارے اندر قوت تجزیہ پروان چڑھ رہی ہوتی ہے لیکن اس کا منفی اثر بھی عجب وتکبر کی شکل میں سامنے آسکتا ہے کہ یہ لوگ مجھ سے اتنا متاثر ہیں اس کا مطلب مجھے تو سب آتا ہے اور پھر یہ عجب مزید علم کی جستجو ہی ہمارے اندر سے ختم کردے گا۔

۱۴۔ ہاتھ سے لکھنا شروع کریں: یہ تصور کہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے ہزار صفحات کا مطالعہ ہونا چاہئے کسی خاص نوع کے متعلق تو معقول ہے لیکن اپنے عموم کے لحاظ سے غلط، انسان جب سے پڑھنا شروع کرے اسی وقت سے لکھنا شروع کرے کیوں کہ لکھنا پڑھنے کے عمل کو خوبصورت اور دقیق بناتا ہے، فرنٹیئر ان سائیکالوجی میں ۲۰۲۰ کی ایک ریسرچ پیپر کے مطابق بچوں کی دماغی کارکردگی پر ایکسپیریمنٹ اور تجربہ کرتے ہوئے یہ سامنے آیا کہ دماغ کی ایکٹیویٹی سب سے زیادہ اس وقت تھی جب بچے ہاتھ سے لکھ رہے تھے۔

۱۵۔ چاپلوس نہ بنیں مگر بڑے اور کام کے لوگوں سے تعلقات ضرور بنائیں: آج کی نئی نسل تھوڑی ضرورت سے زیادہ بے نیاز ہو چلے ہے، ہمیں دوسرے کے سامنے جھکنا اور مدد مانگنا ہمیشہ چاپلوسی معلوم ہوتا ہے، یاد رکھی کہ یہ فطرت کا اصول ہے کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے، غریب کو اگر اپنی غربت دور کرنی ہے تو اسے کچھ عرصہ امیروں کی صحبت میں رہنا ہوگا، دھیروبھائی امبانی کا واقعہ یاد ہوگا، جاہل کو اگر عالم بننا ہے تو اسے ایک مدت عالموں کیساتھ رہنا ہوگا، اسی طرح اگر کسی کو کسی فیلڈ میں بڑے مقام پر پہنچنا ہے تو اس فیلڈ کے اونچے مقام ومنصب والوں کے ساتھ رسم وراہ بڑھانی ہوگی، اسے بنیاد سمجھنا ہمیں

چاپلوس بناتا ہے اور اپنی صلاحیت کو بنیاد بناکر اسے معاون بنانا ہماری صلاحیتوں کی صحیح کھپت کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے، ورنہ تو اسے مکمل مضر سمجھ کر ہزاروں صلاحیت والے اسی زعم میں خانماں برباد ہوئے بیٹھے کہ ہم صلاحیت والے ہیں وہ ہمارے پاس آئے ہم کیوں جائیں اس کے پاس، بہر حال ہم جس فیلڈ میں بھی اس فیلڈ کے بڑوں سے ربط رکھنا بہت ضروری ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔

۱۶۔ ڈایا گرام اور نقشوں کے ذریعے چیزوں کو لکھیں پڑھیں اور یاد کریں: چوں کہ ذہن مربوط چیزوں کو جلدی کیچ کرتا ہے نیز دماغ کے خلیے بھی اسی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں تو ظاہری مشابہت ہونے کی وجہ سے بھی ڈایا گرام اور مائنڈ میپنگ کے ذریعے لکھنا ہماری تخلیقی صلاحیت اور یادداشت کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔

۱۷۔ چار پانچ کلر والے قلموں یا رنگیں sticky notes کا استعمال کریں: ہارورڈ کے نیوروسائنس دانوں کی ریسرچ کے مطابق ہمارے دماغ کے مختلف حصے مختلف رنگوں کو پروسیس کرتے ہیں تو اگر ہم ایک کلر میں دیکھ رہے یا لکھ رہے ہیں تو دماغ کا ایک چھوٹا حصہ کام کرتا ہے اور وہی چیز اگر ہم مختلف رنگوں میں لکھیں گی تو پھر دماغ کے زیادہ حصے پروسیس کریں گے اور وہ زیادہ دیر یاد رہیں گی اور اس کی کام کی رفتار بھی بہت زیادہ تیز ہو جائے گی۔

۱۸۔ موبائل کے سارے نوٹیفیکیشنز بند کردیں: کیوں کہ اس وقت سب سے زیادہ دھیان بھٹکانے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ نوٹیفیکیشن ہے، ان ایپس کو اتنی اوقات نہ دیں کہ وہ ہمارے دھیان کو بھٹکا سکیں، صرف ضرورت کے نوٹیفیکیشن کے علاوہ سارے نوٹفکیشنز بند کردیں۔

۱۹۔ اپنے انٹرٹیمنمنٹ اور سنجیدہ کاموں میں تناسب برقرار رکھیں: انٹرٹیمنمنٹ دماغ کو ریفریش کرنے کے لیے ضروری ہے، لیکن دھیان رہے کہ انٹرٹیمنمنٹ کا تناسب تیس فیصد

سے آگے نہ بڑھنے پائے ورنہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑ جائیں گی اور ہماری زندگی بس ایک مذاق بن کر رہ جائے گی۔

۲۰۔ قناعت پسند عورت سے ہی شادی کریں: شادی کے بعد کی پوری زندگی بیوی کے مزاج واوصاف پر منحصر ہوتی ہے اس لیے کبھی پیسوں کی لالچی عورت سے شادی نہ کریں وہ پیسوں کی قلت کی دہائی دیکر علمی دنیا چھوڑنے پر بھی مجبور کرے گی اور بچوں کو بھی اسی قسم کی مادیت پرستار بنائے گی نتیجتہ تخلیقی صلاحیتیں صرف ہم سے نہیں ہماری نسلوں سے بھی چھین جائیں گی، اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے، اس لیے شادی کے وقت اس سے اس کی پسند ناپسند ترجیحات اور قناعت اور ذہنیت کا سوال کر کے اندازہ لگالیں کہ یہ ہمارے حصول علم میں مانع تو نہیں بنے گی؟

۲۱۔ دماغ کو غذا پہنچائیں: جس طرح جسم کی بھوک مٹانے کے لیے ہم کھانا کھاتے ہیں اسی طرح دماغ سے غیر معمولی کام لینے کے لیے روزمرہ صحت مند غذاؤں کے ساتھ ساتھ اس کی مخصوص غذاؤں کا اضافہ کرنا ہوگا، ریسرچ کے مطابق ہمارا دماغ fat کے وافر مقدار مشتمل ہوتا ہے اور اس کی چکناہٹ دماغ کے ایک خلیے سے دوسرے خلیے تک معلومات تیزی سے منتقل کرنے میں مدد کرتی ہے جسے neuroplasticity کہتے ہیں اور اس کے لیے fatty acid اومیگا تھری بے حد مفید ہے، اومیگا3 کی تین قسمیں ہیں:
ALA, EPA, DHA پہلی قسم اخروٹ، انڈے اور کچی سبزی وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور بقیہ دو مچھلی اور اس کے تیل سے حاصل کی جاتی ہیں اسی لیے مچھلی کھانے والے لوگ ذہین ہوتے ہیں، لہٰذا اخروٹ اور مچھلی یا اس کا تیل روزانہ استعمال کیا کریں۔

۲۲۔ جسمانی ورزش کریں: جو ورزشیں دل کی دھڑکن اور سانسوں کی رفتار کو تیز کرتی ہیں (aerobics) مثلاً دوڑنا، سائیکل چلانا، تیراکی ذہن کے لیے مفید ہیں کیوں کہ یہ دماغ میں خون کے دورانیے کو تیز کر دیتی ہیں، انرجی میٹابولزم میں اضافہ کرتی ہیں، خوشی اور

ایکسائٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے نیوروٹرانسمیٹر مثلاً ڈوپامین سیریٹونین کی مقدار میں اضافہ کرتی ہیں جس سے ہماری دماغ کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۳۔ سوچتے اور پڑھتے وقت وقفے وقفے سے پانی پیتے رہیں: نیوروسائنس کہتی ہے کہ پانی ہمارے جسم میں ساٹھ فیصد، اعصاب میں پچھتر فیصد اور دماغ میں اسی فیصد یعنی سب سے زیادہ موجود ہوتا ہے، یعنی پانی کی کمی سب سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہے، ایسے لوگ سر کے درد اور فوکس نہ کر پانے کے شکار ہو جاتے ہیں، اور ریسرچ یہ بتاتی ہے کہ پانی بھرپور مقدار میں پینے پر دماغ چودہ فیصد تیز کام کرتا ہے۔

۲۴۔ خوابوں کو اہمیت دیں: یہ ہماری بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم نے شریعت میں اس کے حجت نہ ہونے کو اپنے لیے بھی اہم نہ ہونے سے خلط ملط کر دیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ غیر نبی کا خواب شریعت میں حجت نہیں لیکن انسان کی اپنی زندگی میں خوابوں کی بڑی اہمیت ہے، خود حضور ﷺ نے خواب کو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا ہے اور فجر کے بعد مجلس میں صحابہ اپنے خواب حضور سے بیان کیا کرتے اور حضور ﷺ اس کی تعبیر بتایا کرتے تھے، مغرب میں فرائیڈ وغیرہ نے اس پر کافی کام کیا ہے، بہر حال نیند سے اٹھنے کے بعد سب سے پہلے کلمہ پڑھیں اور پھر اپنے خواب کے بارے میں سوچیں کہ میں نے کیا خواب دیکھا اور پھر معبرین سے اس کی تعبیر پوچھیں، کبھی کبھی دن بھر سوچ جانے والے مسئلے کا حل اور کبھی مستقبل کی خوش خبریاں یا احتیاط کے اشارے خوابوں سے مل جاتے ہیں، یہ بڑا المیہ ہے کہ ہمارے یہاں سے اب معبرین ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

۲۵۔ کسی تنظیم سے جڑ کر زمانۂ طالب علمی سے ہی فلاحی وسماجی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیں: اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم لوگوں کے احوال ومسائل سے واقف ہو سکیں گے، اپنے تجربات، سماجی ذہانت، لوگوں کے تئیں ہمدردی، نفع رسانی کے جذبے اور تجزیاتی قوت میں اضافہ کر کے اپنی ترجیحات کی تعیین کر سکیں گے ویسے تو پچاسوں طریقے بیان کئے جا سکتے

ہیں لیکن بندہ نے انہیں طریقوں کا انتخاب کیا ہے جنہیں اپنی زندگی میں برتتا ہے تاکہ مضمون کے ذریعے محض ریسرچ کی ترسیل نہ ہو بلکہ خیالات کی ترسیل کے ساتھ ساتھ عمل کی ترسیل بھی ہو سکے اور ان کا ہماری عملی زندگی میں اثر ہو مزید چند پوائنٹس ہیں جن کا طلبا کے مقابلے اداروں سے زیادہ لینا دینا ہے اس لیے ہم انہیں اگلے مضامین کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں یہ مشن تقویت امت پر لکھے گئے مضامین کی دسویں قسط ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

دوسروں کو حقیر سمجھنے کی نفسیات

حدیث شریف ہے کہ انسان کے بُرا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔

دوسروں کو حقیر سمجھنے اور اپنے آپ کو بہتر سمجھنے کی نفسیات یا ادا ایسی ہے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، اس کی وجہ سے فرد گرادیا جاتا ہے۔

فرد کی عام طور پر حالت یہ ہے کہ تھوڑا سا علم آجانے اور تھوڑی عبادت کرنے سے وہ اپنے آپ کو افضل سمجھنے لگتا ہے، وہ اپنی خامیوں کو دیکھنے کی بجائے دوسروں کی کمزوریوں کو دیکھنے لگتا ہے، یہ انسانی نفس کی سب سے بُری خاصیت ہے، حالانکہ فرد اگر خود احتسابی سے کام لے تو اسے اپنی شخصیت میں کافی خرابیاں نظر آئیں گی، مثلاً دنیا کی محبت کا ہونا، حسد کا ہونا، عبادت سے دلجمعی کا نہ ہونا، دوسروں کی گلا و غیبت کا ہونا، تنقید کا برداشت نہ کرنا وغیرہ اس طرح کی بہت ساری خرابیاں افراد میں موجود ہوتی ہیں، لیکن اندر میں ڈوبنے سے کام نہ لینے کی وجہ سے وہ اپنی ان خرابیوں کو دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے، جب کہ دوسروں کی چھوٹی بُرائیاں بھی اسے بڑی بُرائیاں نظر آتی ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ہے کہ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم میں کسی ایک کا بھی تزکیہ نہ ہو سکتا تھا۔

انسان عبد (بندہ) کی حیثیت سے پیدا ہوا ہے، بندہ کی شان یہ ہے کہ وہ عاجز بن کر رہے اور اپنے آپ کو مٹاتا رہے اور اس پر یہ احساس غالب ہو کہ اللہ کے بندوں میں سب سے

زیادہ سیہ کار وہی ہے، چاہے وہ کتنا ہی عبادت گذار اور عابد اور زاہد ہو، لیکن اپنی سیہ کاری کے احساس کا غالب ہونا ناگزیر ہے، اس لئے کہ بندہ کتنا ہی عابد اور ذاکر ہو، وہ اللہ کا حق عبدیت کسی بھی طور پر ادا نہیں کر سکتا، لیکن فرد کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ نفس اسے ہرا پھرا کر اپنے افضل ہونے کے احساس کی طرف لاتا ہے، یہ تکبر کی علامت ہے جو شیطان کی خصوصیت ہے۔

اپنے آپ کو حقیر اور عاجز ہونے کی سطح پر لانے کے لئے خود احتسابی اور اندر میں ڈوبتے رہنے کے ذریعہ نفس کی قوت سے جنگ لڑنی پڑتی ہے، نفس اس کے بغیر اپنی بُرائی اور دوسروں کی تحقیر کی ادا سے نہیں بچ سکتا۔

عبادت، ذکر، زہد اور علم اپنے ساتھ یہ خطرہ بھی لاتا ہے کہ فرد اپنے آپ کو ہستی سمجھنے لگے، اس لئے اس سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد جنہوں نے اپنے آپ کو مٹایا ہے ان کی صحبت اختیار کی جائے۔

معاشرے میں دینی خدمت کے نام سے جو شخصیتیں دوسروں کی تردید و تکذیب اور اپنے آپ ہی کو برسر حق سمجھنے کے لئے کوشاں ہیں، ان شخصیتوں کی نفسیات کا مطالعہ ہو گا تو معلوم ہو گا کہ علم نے انہیں دھوکہ دے کر اپنی برتری کی راہ پر گامزن کیا ہے، اگر وہ خود احتسابی سے کام لیتے تو وہ ایسا ہر گز نہ کرتے۔

بندہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ نفس جب بھی اسے اپنے آپ سے غافل کر کے دوسروں کی خامیوں کو تلاش کرنے پر ابھارے تو اس وقت نفس کے ساتھ مکالمہ کرنا چاہئے کہ کیا وہ ان ان بُرائیوں سے محفوظ ہو چکا ہے، اگر نہیں تو اسے ایسا ہر گز نہیں کرنا چاہئے، ورنہ وہ گرا دیا جائے گا۔

ہمارے کچھ اہم معاملات
احادیث نبوی کی روشنی میں

مومن کی تعریف کرنا
اس کے لئے پیشگی خوش خبری کا ہونا

حضرت ابوذر غفاری رضہ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ یہ فرمائیں کہ فرد کوئی اچھا عمل کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں، (یہ ریاکاری تو نہیں) آپ نے فرمایا، یہ مومن کے لئے پیشگی/نقد خوش خبری ہے۔(صحیح مسلم)

بندے کے ساتھ جب اللہ کا فضل خاص شامل حال ہو جاتا ہے اور مجاہدوں سے اس کا نفس قابل ذکر حد تک سنور جاتا ہے تو اس کے سارے کام اللہ کے لئے ہونے لگتے ہیں، اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے ہونے والے دعوتی کاموں اور شخصیت کی اخلاقی خوبیوں میں ایسی تاثیر رکھی گئی ہے کہ ایسے افراد کے لئے دلوں میں محبت پیدا ہونے لگتی ہے اور ان کی تعریف و تحسین بھی۔ اس تعریف و تحسین سے خود ثنائی پیدا ہونے کی بجائے اللہ کی شکر ادائیگی کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے، اس طرح کی تعریف کو اللہ کے رسول ﷺ نے بندے کے لئے پیشگی خوش خبری فرمایا ہے۔

لوگوں کی تعریف کے باوجود بندہ مومن خود احتسابی سے بے نیاز نہیں ہوتا، وہ باریک بینی سے جائزہ لیتا رہتا ہے کہ کہیں اس طرح کی تعریف سے نفس میں خوشی کی حالت تو پیدا نہیں ہوتی۔

اگر خوشی کی حالت پیدا ہوتی ہے تو وہ توبہ استغفار کرتا رہتا ہے۔

فرد کے اچھے اور بُرے ہونے کی علامت

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے کچھ لوگوں کی مجلس کے پاس کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا، کیا میں تمہیں تمہارے اچھے اور بُرے کی خبر نہ دوں، ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ ضرور بتائیں، آپ نے فرمایا، تم میں سے بہتر وہ ہے جس سے اچھائی کی امید رکھی جائے، اور اس کے شر سے بچا جاسکے، اور تم میں سے بُرا وہ ہے جس سے بھلائی کی امید نہ رکھی جاسکے اور اس کے شر سے محفوظ نہ رہا جاسکے۔ (صحیح بخاری)

اس حدیث شریف میں اچھے اور بُرے شخص کے مزاج کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، ہمارے ہاں تزکیہ نفس کے لئے جو مجاہدے کرائے جاتے رہے ہیں، اس میں طالب، نفس میں موجود شر کی ساری قوتوں اور اس کی مکر و فریب کی ساری واردات سے رفتہ رفتہ نہ صرف آشنا ہونے لگتا ہے، بلکہ نفس میں موجود شر کی جگہ خیر کی قوت کو غالب کرنے یعنی نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کے پہلے مرحلے میں داخل کرنے کی خصوصیت کا حامل ہوتا رہا ہے، نفس کو سنوارنے کا بنیادی ہدف اور اس کا مرکزی نکتہ ہی یہی رہا ہے کہ اپنے نفس کی شرارتوں سے دوسروں کو محفوظ رکھا جائے، اور شخصیت پر خیر کے پہلو کو اتنا غالب کیا جائے کہ دوسروں کو نفع پہنچانے اور ان کے لئے خیر و بھلائی کا ذریعہ بننے کا مزاج غالب ہو جائے۔

اب تو مادیت پرستی اور نفس پرستی پر مشتمل ماحول کے غلبے کی وجہ سے نفس کو سنوارنے اور اس کی ہیت کو تبدیل کرنے کے کام کی اہمیت ہی باقی نہ رہی ہے، جس کی وجہ سے شر سے بچنا اور خیر کی امید رکھنا دشوار تر ہو گیا ہے، اللہ ہمارے باطن کی آنکھیں کھول دے اور ہمیں شر اور خیر کو سمجھنے اور شخصیت پر خیر کو غالب کرنے کی راہ پر گامزن کر دے۔

محبت کرنے والے سے حشر میں ساتھ ہونا

حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ سے قیامت سے متعلق سوال کیا کہ وہ کب قائم ہوگی، آپ نے ارشاد فرمایا، تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے عرض کیا کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ

سے محبت کرتا ہوں، بس آپ نے فرمایا، پھر تمہارا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا، جن سے تمہیں محبت ہے، حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں، آپ کی کبھی کسی بات سے ہمیں اتنی خوشی نہیں ہوئی، جتنی آپ کی یہ حدیث سن کر ہوئی کہ تمہارا حشر انہی کے ساتھ ہوگا، جن سے تمہیں محبت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پس میں نبی ﷺ اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اور ان سے اس محبت کی وجہ سے میں امید رکھتا ہوں کہ میرا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا، اگرچہ میں ان جیسے عمل نہیں کر سکا۔ (صحیح ابن حبان ۱۰۵۸)

یہ حدیث شریف اس سے پہلے بھی مختصر الفاظ میں آچکی ہے، اس حدیث سے محبت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کے ساتھ یا متقی افراد سے محبت کی وجہ سے قیامت میں انہی کی معیت نصیب ہوگی، اس سے بڑھکر سعادت اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن محبت کہنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کے لئے دل کو غیر اللہ کی محبتوں سے خالی کرنا پڑتا ہے اور اللہ و رسول اور اللہ کے دوست کی محبت سے سرشار ہونا پڑتا ہے، محبت کی یہ بھی خاصیت ہے کہ اس کی وجہ سے اعمال میں پاکیزگی ہونے لگتی ہے، اگر اللہ کے دوست سے محبت ہے تو اعمال میں ان سے مشابہت ہونے لگتی ہے، اللہ کے دوست کی محبت فرد کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہے، اس لئے محبت کے رشتہ کا منسلک ہونا ضروری ہے، محبت وہ طاقتور عمل ہے کہ وہ پوری شخصیت کو بدل دیتی ہے، محبت کی اس خاصیت کی وجہ سے ہی فرد قیامت کے دن محب کے ساتھ ہوگا اور اس کی معیت میں ہوگا۔

تین خصلتوں کے اثرات

فرمایا: صدقہ مال کو کم نہیں کرتا، اور کسی کو معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے اور جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتے ہیں۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۶۵۹۲)

اس حدیث شریف کے دو نکات اس سے پہلے آچکے ہیں۔

صدقے سے مال کم نہیں ہوتا، یہ بہت اہم نکتہ ہے، بظاہر مال کم ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن صدقے سے برکت ایسی ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ مال مختلف طریقوں سے آنے لگتا ہے، تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے، اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مال کی محبت میں کمی آنے لگتی ہے، تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے دل میں سکون قلبی آنے لگتا ہے، گویا دل فرد کو کہتا ہے کہ تم نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرکے میرے لئے راحت کا سامان فراہم کیا ہے، اللہ کے لئے مال خرچ کرنے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے قرار آتا ہے۔

جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا

فرمایا: جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ رحم نہیں کرتا۔ (الادب المفرد حدیث نمبر:۹۵)

یہ حدیث شریف پہلے بھی آچکی ہے، لیکن وہاں غالباً حوالہ نہیں ہے، وہاں اس کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ کافی ہے۔

مومنوں کا ایک دوسرے کے لئے شفیق ہونا

فرمایا: مومنوں کی مثال آپس میں ایک دوسرے سے محبت اور رحمت وشفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند ہے۔ (مسلم شریف ۶۵۸۶)

یہ مومنوں کی مثالی حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت، رحمت اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں، اور اس اعتبار سے وہ ایک جسم کی مانند ہیں، لیکن جب ایمان کی حالت کمزور ہوتی ہے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہونے لگتا ہے اور ایک دوسرے سے نفرت، کدورت، دوری اور دشمنی کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے، اس وقت کی مسلمانوں کی حالت اس کا منظر پیش کررہی ہے، اور ہر شعبے سے وابستہ مسلمان ایک دوسرے سے رسہ کشی کی حالت میں مبتلا ہیں، سیاسی سطح پر دیکھیں یا معاشرتی اور کاروباری سطح پر، ہر جگہ آپ کو یہی منظر نظر آئے گا، اس کی وجہ سے دوسری قوموں پر مسلمانوں کا رعب ختم ہوگیا ہے، اس

حالت کو بدلنے کی ضرورت ہے، یہ تبھی ہوگا، جب ایمان کی حالت بہتر ہوگی، ایمان کی بہتر حالت مسلمانوں کو محبت کی راہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اس شخص کا ہم سے تعلق نہ ہونا

فرمایا: اس شخص کا ہم (مسلمانوں) سے کوئی تعلق نہیں، جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑے کی شرف وفضیلت کو نہیں پہنچانتا۔ (ترمذی، ۳۶۹/۳، حدیث:۱۹۲۷)

یہ اخلاقیات اور ادب وآداب کو ملحوظ خاطر رکھنے والی حدیث ہے، موجودہ دور میں بچے کی تربیت جس ماحول میں ہورہی ہے، اس سے بڑوں کا احترام باقی نہیں رہتا اور ادب وآداب کا تو سرے سے ہمارا نظام ہی ختم ہوگیا ہے، بڑوں کے مزاج میں عام طور سختی پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے شفقت کرنے اور ان کی محبت سے تربیت کرنے کی صلاحیت بُری طرح متاثر ہے، مادیت پسندی کی ایسی لہر چلی ہے کہ ہماری ساری روایات اس کی نذر ہورہی ہیں۔

پردہ پوشی کرنے والے کو ملنے والا انعام

فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (صحیح مسلم/ الذکر ۱۱/۲۲۹۹)

مسلمانوں کے عیبوں کو ظاہر نہ کرنے پر کتنی بڑی خوش خبری سنائی گئی ہے کہ قیامت کے دن (جب ہر شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے کانپ رہا ہوگا) اس وقت اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرنے کی خوش خبری سنائی گئی ہے، ہمیں حوصلے اور ہمت سے کام لے کر نفس پر جبر کرکے بھی دوسرے مسلمانوں بالخصوص اپنے عزیز واقارب اور دوست واحباب کی کمزوریوں اور عیوب کو چھپانا چاہئے، اگرچہ نفس ایسا ہونے نہیں دے گا، لیکن نفس پر جبر کرکے بھی ایسا کرنا چاہئے۔

جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں

فرمایا: اس شخص کا ایمان نہیں جس میں امانت نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں، جو وعدہ پورا نہیں کرتا۔(بیہقی ۱۲۶۹۰)

اس حدیث شریف میں امانت اور وعدے کی غیر معمولی اہمیت بیان فرمائی گئی ہے، بدنصیبی سے موجودہ دور میں یہی دونوں چیزیں ہیں، جو تیزی سے رخصت ہو رہی ہیں، قومی خزانے کے جو امین ہیں، ان کی تو بہت بڑی تعداد امانت میں خیانت کی مریض ہے، قوم کو مفلس بنانے کی قیمت پر وہ امیر سے امیر ترین بن رہے ہیں، یہ محض امانت میں خیانت کی وجہ سے ہے، وعدہ کر کے اسے پورا نہ کرنا، یہ تو آج کل عام سی بات ہو گئی ہے، حالانکہ یہ ایمان اور دین کے مسائل ہیں، ایمان اور دین کی اہمیت کے حامل مسائل کو سمجھکر ان کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے، اسی سے ہماری اسلامیت بھی وابستہ ہے تو قوم وملت کی فلاح و بہبود بھی۔ ورنہ امانت میں خیانت کے بڑھتے ہوئے، مرض کی وجہ سے ہمارے اہل سیاست اور مقتدر طبقات نے تو قوم کو عالمی اداروں کے ہاں گروی رکھ دیا ہے۔

اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرما کر ہماری اصلاح کی صورت پیدا فرمائے۔(آمین)

اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس پر ڈٹ جانے کی تاکید

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کی، اللہ کے رسول، آپ مجھے اسلام میں ایسی بات بتائیں کہ آپ کے بعد میں کسی سے سوال نہ کروں، آپ نے فرمایا، تو کہہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ڈٹ جا۔(مشکوٰۃ ۱۵)

اللہ پر ایمان لا کر اس کے تقاضوں کو زندگی بھر پورا کرتے رہنا اور ایمان پر ڈٹ جانا، یہ سب سے بڑی کرامت ہے، اس سے بڑھکر کوئی کرامت نہیں، ایمان اپنے ساتھ اعمال کے تقاضے لاتا ہے اور نفس پرستی اور مادیت پسندی کے تقاضوں سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کرتا ہے، ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہی ایمان پر ڈٹ جانا ہے، اس حدیث شریف میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔

مجھے تمہارے فقر و تنگ دستی کا اندیشہ نہیں

فرمایا: اللہ کی قسم مجھے تمہارے فقر و تنگ دستی کا اندیشہ نہیں، بلکہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر بھی اسی طرح کشادہ کر دی جائے گی، جیسے تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کر دی گئی تھی اور تم بھی اس کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی اسی طرح کوشش کرو گے، جس طرح وہ کرتے تھے، وہ تمہیں بھی اسی طرح غافل کر دے گی، جس طرح ان لوگوں کو غافل کیا تھا۔(مشکوٰۃ حدیث نمبر: ۵۱۶۳)

اللہ کے رسول ﷺ کی اپنی امت کے بارے میں دنیا کے حوالے سے فکرمندی کا ہونا، آپ کی امت سے غیر معمولی محبت کی علامت ہے، آپ کا یہ فرمانا کہ مجھے امت کی فقر و تنگ دستی کا اندیشہ نہیں، اندیشہ دنیا کے حوالے سے ہے کہ وہ کشادہ کر دی جائے گی تو اس کی وجہ سے اعمال صالحہ، رجوع الی اللہ اور آخرت کے حوالے سے غفلت پیدا ہو گی۔

فقر و تنگ دستی کی حالت سے فرد کی طبیعت میں مسکینی کا رنگ غالب ہوتا ہے، مسکین فرد عام طور تکبر سے محفوظ ہوتا ہے، اس میں اللہ سے مانگنے کی نفسیات پیدا ہوتی ہے، اس لئے فقر و تنگ دستی ایسی بات نہیں ہے، جو زیادہ تشویش کی بات ہے، تشویش کی بات دولت کا کشادہ ہونا ہے، اس کا مشاہدہ ہے کہ جن کے پاس دولت آتی ہے، وہ عام طور پر دنیا کی راحت وآسائش کے سامان میں مصروف ہو کر اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں۔

کچھ آخری دور کے فتنوں کے بارے میں

آخری دور میں فتنوں کی یلغار ہو گی، ایک فتنہ ابھی تھمے گا نہیں تو دوسرا فتنہ پیدا ہو گا، اس طرح امت نئے نئے فتنوں کی زد میں آتی رہے گی، ان فتنوں کی نوعیت کو سمجھکر ان سے بچنے کی فکر کا ہونا، ایمان کا اولین تقاضا ہے، موجودہ دور میں عالمی کفر اور مادیت کی عالمگیر قوت نے ایسی ہمہ گیریت حاصل کر لی ہے کہ لگ بھگ ہر فرد اس کے اثرات کی زد میں ہے، اور مسلمانوں کی ذہنی اور عملی طور پر حالت ایسی کمزور ہو رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے لئے ابتلا وآزمائش و فتنوں کا ذریعہ بن رہے ہیں، ذیل میں اس طرح کی کچھ احادیث شریف پیش کی جا رہی ہیں۔

قاتل بننے کے بجائے مقتول بن جانا

فرمایا: ایسے فتنے، اختلافات اور افتراق ہو گا کہ اگر تم اس بات پر قدرت رکھو کہ قاتل بننے کی بجائے مقتول بن سکو تو بن جاؤ۔ (مستدرک حاکم)

یعنی دوسرا تمہیں مارنے پر تلا ہوا ہو گا، اس صورت میں دوسرے کا مقابلہ کرنے کی بجائے مقتول بن کر اللہ کے حضور پیش ہونا افضل ترین عمل ہے۔

فرمایا: تم فتنوں سے بچو کہ اس میں زبان کا اثر ایسا ہوتا ہے جیسے تلوار کا۔ (ابن ماجہ حدیث نمبر: ۳۹۶۷)

موجودہ دور میں بالخصوص سوشل میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے زبان کے ذریعے جو فتنے عام ہو رہے ہیں، وہ ہمارے مشاہدہ کی بات ہے، جو جتنی زیادہ افتراق اور امت میں انتشار پیدا کرنے کا بات کرتا ہے، اس کو اتنی زیادہ تعداد میں سنا جاتا ہے، اس طرح زبان کے ذریعے کروڑہا افراد فکری انتشار کا شکار ہو رہے ہیں۔

فرمایا: قیامت کے قریب قتل وقتال کا زمان ہو گا، جس میں کفار سے قتال نہ ہو گا، بلکہ امت آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرے گی، یہاں تک کہ ایک آدمی سے اس کا بھائی ملے گا، وہ اس کو قتل کر دے گا، اس زمانہ کے لوگوں کی عقلیں سلب کر لی جائیں گی اور اس کے بعد ایسے کم عقل لوگ ہوں گے، جو اپنے آپ کو یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت کچھ ہیں، حالانکہ وہ کچھ بھی نہ ہوں گے۔ (مسند احمد)

ہمارے ہاں لسانی قومیتوں کی بنا پر سابق مشرقی پاکستان اور سندھ میں لسانی قومیتوں کے علمبرداروں کی طرف سے ایک دور میں قتل غارت کا بازار گرم ہو چکا ہے، جس میں بہت سارے مسلمان مارے گئے، اس طرح کی لہریں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور مزید پیدا ہونے کے واضح آثار موجود ہیں۔

حرام وحلال کی تمیز کا نہ ہونا

فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انہیں اس بات کی کوئی فکر لاحق نہ ہو گی کہ ان کے پاس مال حلال طریقے سے آیا ہے یا حرام طریقے سے۔ (سنن النسائی: ۴۴۵۶)

اس دور میں مال کی محبت کی وجہ سے مؤثر طبقات کی طرف سے لوٹ مار کا ایک سلسلہ ہے، جو جاری ہے، قومی خزانے کی لوٹ مار کی وجہ سے قوم کو مالیاتی عالمی اداروں کے سامنے گروی رکھ دیا گیا ہے اور ریاستی طور پر ایسی پالیسیاں اختیار کی گئی ہے کہ جو شخص جس طریقے سے بھی مال بناتا ہے، اسے اس کی اجازت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس مال میں اہل اقتدار اور سرکاری عمال کا حصہ شامل ہو۔

آدمی کا اپنی بکری سے زیادہ ذلیل ہونا

فرمایا: ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی اپنی بکری سے زیادہ ذلیل ہو گا۔ (أخرجه الطبراني في المعجم الكبير، ۲۲۹/۱۰، الرقم/۱۰۵۵۶)

یعنی فرد کی عزت جانور سے بھی کم تر ہو گی، یہ کتنی المناک حالت ہے، جس کا اس حدیث شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

دنیا کے سب سے نیک انسان کو
ذلیل سمجھنا، آخری دور کی علامت

فرمایا: قیامت اس وقت تک نہ آئے گی، جب تک دنیا کا سب سے نیک شخص رذیل ابن رذیل نہ ہو جائے گا۔ (ترمذی شریف)

چند سال پہلے علماء کرام کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس سلسلے میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب پر بھی گولیاں چلائی گئیں، اللہ نے انہیں بچا لیا، جب کہ ان کا ڈائیور شہید ہو گیا، اس طرح کے واقعات جو آئندہ شدت سے پیش آئیں گے، ان سے ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر ہو گا کہ معاشرے میں نیک آدمی کی عزت ختم ہوتی جا رہی ہے، انہیں بوجھ سمجھ کر راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

نااہل افراد کو معاملات سونپنا قیامت کی علامت کا ہونا

فرمایا: جب امانت ضایع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، آپ سے دریافت کیا گیا کہ امانت کا ضیاع کس طرح ہوگا تو آپ نے فرمایا کہ نااہل افراد کو معاملات سونپ دیئے جائیں گے تو قیامت کا انتظار کرو۔(بخاری شریف ٦٤٩٦)

اس حدیث شریف کے آثار ظاہر ہورہے ہیں، بڑے بڑے قومی معاملات ایسے لوگوں کے سپرد کردیئے جاتے ہیں، جو مال جمع کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں، جو ذاتی مفاد کو قومی وملی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

صبر پر ڈٹے رہنے کا اجر

فرمایا: تمہارے بعد ایک صبر کا زمانہ ہے، جس میں صبر پر ڈٹے رہنا ایسا ہے، جیسا تم (صحابہ کرام) میں سے پچاس شہیدوں کا ثواب حاصل کرنا۔(الترمذی: ٣٠٥٨)

یعنی جب اجتماعی ملی زندگی میں بگاڑ غالب ہو، مارا ماری، نفسا نفسی اور لوگوں پر غیظ وغضب اور اشتعال کی حالت طاری ہو تو اس وقت لوگوں کے معاملات میں پڑنے کی بجائے اپنی فکر کرنی چاہئے اور صبر کے ساتھ اپنی اصلاح کی راہ پر گامزن ہونا چاہئے، اس سلسلے کی ایک دوسری حدیث شریف ہے کہ جب ایسا زمانہ آجائے کہ ہر فرد اپنی رائے پر بضد ہو، (یعنی حق بات سننے کے لئے تیار نہ ہو) اس وقت تم دوسروں کی فکر چھوڑ کر اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ۔